Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1973

اس پرچہ میں

پرویز صاحب کا استقبالیہ

آئندہ پرچہ میں

کنونشن کے خطابات اور مقالات

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدل اشتراک پاکستان سالانہ ——— دس روپے غیر ممالک سالانہ ——— ایک پونڈ	**ٹیلیفون** ۸۰۸۰۰ **خط و کتابت** ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی، گلبرگ ۲۔ لاہور	**قیمت فی پرچہ** ☆ ایک روپیہ
جلد (۲۶)	دسمبر ۱۹۷۳ء	نمبر (۱۲)

فہرست

(۱) غلامی سے بدتر ہے بے یقینی — محترم پرویز صاحب — (۳)

(۲) یہ بھی شریعت وہ بھی شریعت — محترم محمد اسلم صاحب — (۲۵)

(۳) طلوعِ اسلام کی سولہویں سالانہ کنونشن — (۳۹)

(۴) اسلام میں سزائے ارتداد — شاہد عادل — (۴۱)

(۵) شاہکارِ رسالت — (۵۱)

(۶) بابُ المراسلات — وفاتِ و حیاتِ مسیح (تفہیم القرآن) — (۵۷)

[illegible] مقامِ اشاعت: ۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور [illegible] لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

(استقبالیہ)

زمیلانِ محترم و رفیقانِ مکرم۔ سلام و رحمت!

سال گذشتہ یہ طے پایا تھا کہ امسال ہمارا یہ قرآنی اجتماع "جشن نزول قرآن (عیدالفطر)" سے ہوست شروع نومبر میں منعقد ہو جانا چاہیئے۔ لیکن گذشتہ موسم برسات میں عالمگیر سیلاب نے جو تباہیاں برپا کیں، ان کے پیش نظر ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اس سال یہ اجتماع شاید منعقد ہی نہ ہو سکے۔ ہماری بیشتر بزمیں اس سیل بے پناہ کی رہگذر میں واقع ہوئی تھیں اور ہم سمجھتے تھے کہ ان کے اقتصادی حالات مزید گرانباری کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ اسی بنا پر ہم نے بزموں سے مشورہ ضروری سمجھا۔ اندازہ ہمارا یہ تھا کہ بیشتر بزمیں اس کے التوا کا مشورہ دیں گی لیکن ان کی طرف سے جو جوابات موصول ہوئے انہیں دیکھ کر میری نگاہوں میں امید افزا چمک اور خون میں انبساط انگیز حرارت پیدا ہو گئی؛ اور بارگاہِ قرآنی کو چشم تصور میں اپنے سامنے لا کر میں بیساختہ پکار اٹھا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں — آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

ہمارے ان قلندران مجلس فرقانی کا یک زبان جواب یہ تھا کہ آپ التوا کا کہہ رہے ہیں، اور ہمارے نزدیک یہی وہ حوادث ہیں جن میں ان اجتماعات کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ ان بظاہر یاس انگیز اور ہمت شکن مواقع پر، ہم آہنگ احباب کا یکجا بیٹھنا موجب ہزار تقویت اور باعث صد اطمینان ہوتا ہے، اور ناسازگار حالات کی ان بھیانک تاریکیوں میں، قرآنی راہ نمائی کی قندیل نورانی زندگی کے نئے نئے راستے روشن کر دیتی ہے۔ باقی رہیں معاشی مجبوریاں، سو فطرت کا یہ حادثہ ہم سے جو کچھ چرا لے گیا ہے، اگر ہم نے اسے برداشت کر لیا ہے، تو اتنے سے مزید اخراجات جنہیں ہم بطیب خاطر، اپنے جان سے بھی زیادہ عزیز مقصد کی خاطر اٹھائیں گے، ہم پر کیسے گراں گذر سکتے ہیں؟ ہم کنونشن میں آئیں گے اور شاداں و فرحاں، رقصاں و جھناں آئیں گے۔ آپ سوچئے، برادران عزیز! کہ آپ کے ان جوابات نے میرے حوصلے کتنے بلند اور میری ہمتیں کس قدر جوان کر دی ہوں گی۔ قرآنی نگاہ، حوادث کا رنگ کس قدر تبدیل کر دیتی ہے؟

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد ۔ ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

یاس انگیز فضا

عزیزانِ من! جس قسم کے افسردہ اور پژمردہ حالات میں، ہم اس وقت یہاں جمع ہو رہے ہیں، ان کی مثال پاکستان کی ساری تاریخ میں نہیں ملتی۔ ملک مختلف قسم کی ناکامیوں اور نامرادیوں سے اس سے پہلے بھی دوچار ہوا، لیکن قوم کے دل و دماغ کی فضا پر جس قسم کی عالمگیر مایوسی کی گھٹائیں اسوقت چھا رہی ہیں، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسوقت قوم کی حالت یہ ہے کہ جو شخص بھی آپ سے ملے، وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہیگا کہ "اب کیا ہوگا"؟ اور جواب دینے والا مجسمہ نوحہ بن کر کہدیگا کہ:

یوں خدا کی خدائی برحق ہے ۔ پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

ہمیں تو یہ ملک بچتا نظر نہیں آتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ "ابلیس" کے معنی مایوس ہیں۔ کسی قوم کو تباہ کرنے کے لئے اس کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں مایوسی کو عام کر دیا جائے۔ یہ حربہ کسقدر مؤثر ہوتا ہے اسے ایک مثال سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کسی جاں بلب مریض کے متعلق یہ امید دلا دے کہ اس کا علاج ہو سکتا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے تیمارداروں کے دل میں حرکت و حرارت کے نئے ولولے بیدار ہو جائیں گے اور ان کی نگاہوں کے سامنے تگ و تاز کے جدید راستے کشادہ ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ (ڈاکٹر) یہ کہدے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، تو ان (تیمارداروں) کی چلتی ہوئی نبضیں بھی ڈوب جائیں گی۔ دنیا بھر کی دوائیاں ان کے نزدیک بیکار اور سارے جہان کے معالج ان کی نظروں میں ناکام قرار پا جائیں گے۔ ان میں نہ اٹھنے کی سکت باقی رہے گی نہ کچھ کرنے کی ہمت۔ وہ مرنے والے (مریض) سے پہلے مر جائیں گے۔ یہ کچھ کرتا ہے ابلیس کا وہ حربہ جس کی رو سے وہ قوموں کے کان میں یہ مرگ آفریں آواز ڈال دیتا ہے کہ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسوقت ہماری قوم ابلیس کے اسی حربہ کا شکار ہو رہی ہے۔ دانشورانِ قوم اس ہمہ گیر مایوسی کا سبب معلوم کرنے کے لئے سر بجیب دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان کی نگاہیں کسی نہ کسی ہنگامی اور قریبی حادثہ پر جا کر رک جاتی ہیں۔ اس کے حقیقی اور بنیادی سبب تک نہیں پہنچ پاتیں۔ وہ علاماتِ مرض کو دیکھتے ہیں، علتِ مرض ان کے سامنے نہیں آتی۔ علتِ مرض، عزیزانِ من! انہی کے سامنے آسکیگی جو قرآنی روشنی میں اس کی تلاش کریں گے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد کہا تھا کہ ہمیں یہ مملکت، قوم کی فکری صلاحیتوں کی بنا پر نہیں ملی۔ یہ چند اتفاقی اسباب کے جمع ہو جانے کا نتیجہ ہے جو ملت کے رہبرِ فرزانہ، قائدِ اعظمؒ کے حسنِ تدبر و خلوص کی بنا پر ہمارے حق میں مرتب ہو گیا۔ یہ مملکت تو ہمیں اسطرح مل گئی ہے لیکن یہ کبھی مستحکم نہیں رہ سکتی جب تک قوم کے دل و دماغ میں صحیح فکری انقلاب پیدا نہیں ہوگا۔ یہ تنبیہ میری اپنی فکر کی تخلیق نہیں تھی، یہ قرآن کریم کا پیغام تھا جسے میں نے قوم تک پہنچایا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو!

داخلی تغیر

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)

خدا کسی قوم کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔

مجھے قرآن کریم کے اس بنیادی اصول کی صداقت پر اسقدر محکم یقین تھا۔ اور ہر مسلمان کو قرآنی صداقتوں پر اسی قسم کا محکم یقین ہونا چاہیئے۔ کہ میں اسے یہ تکرار و اصرار دھراتا چلا گیا، لیکن قوم اسقدر جذباتی، فلہٰذا سہل انگار اور تن آسان ہو چکی تھی کہ وہ اس فکری تبدیلی کے لئے آمادہ ہی نہ ہوئی۔ یاد رکھیئے، فکری انقلاب مشکل ترین مرحلہ سفر اور بیحد صبر آزما، اور ہمت طلب طریق عمل ہوتا ہے۔ ہنگامہ پسند، محسوسات کی نوگر نگاہوں کو اس میں کچھ ہوتا نظر نہیں آتا لیکن اس کی جگر کاویاں، جاں سوزیاں، اور اختر شماریاں اسقدر اعصاب شکن اور شکیب رُبا ہوتی ہیں کہ ان کے پیش نظر خود خدا کو اپنے رسول سے کہنا پڑا کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ۔ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا۔ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا۔ (۷۳/۱-۳) اے وہ جو اپنے رفقائے سفر کے دلوں میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہے، راتوں کو بہت تھوڑا جاگا کرو۔ نصف شب تک، یا اس سے بھی کم۔ یہ سفر بڑا لمبا ہے اور راستہ بڑا دشوار گذار۔ اس میں تیز روی سے کہیں زیادہ ضرورت جادہ شناسی کی ہوتی ہے۔

قوم اس دور دراز راستہ پر گامزن ہونے کے لئے آمادہ نہ ہوئی اور ہنگامہ آرائیوں میں الجھ گئی۔ لیکن ہنگامہ آرائی کا نتیجہ تو تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر تخریب کے بعد یہ سوال اٹھتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ میرا وہی ایک جواب تھا کہ منزل تک صحیح و سلامت پہنچنے کا راستہ تو ایک ہی ہے اور وہ ہے فکری انقلاب۔ جب تک قوم کے دل و دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہو گی، نہ صرف یہ کہ حالات میں کسی قسم کی اصلاح نہیں ہو سکے گی، بلکہ تخریب دن بدن بڑھتی چلی جائے گی۔ اس پر وہی پرانا اعتراض دھرا دیا جاتا کہ یہ راستہ بہت لمبا ہے۔ کوئی (SHORT CUT) بتایئے۔ لیکن مجھے قرآنی نقشہ میں کوئی (SHORT CUT) نہ ملتا اس لئے میں ان کے اس تقاضا کو پورا نہ کر سکتا۔ قوم پھر اپنی ہنگامہ آرائیوں میں الجھ جاتی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ قوم تو ایک طرف۔ خود آپ کی تحریک میں عجلت سے شامل ہو جانے والے کئی گرم رو نوجوان یہ کہکر آپ سے الگ ہو گئے کہ یہ سست رفتار بے عملوں کی تحریک ہے۔ زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ جب تک قوم میں فکری اور نفسیاتی انقلاب پیدا کریں گے (کہ جسے قرآن ایمان کہہ کر پکارتا ہے) دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہو گی۔ ان کے اس قسم کے شکوک انگیز اور دسوسہ خیز اعتراضات پر ہمارے لئے خدا کا وہی پیغام وجہ سکون بنتا جو ایسے ہی حالات میں اس نے اپنے رسولؐ کو دیا تھا کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ (۷۳/۱۰)۔ ان کی ان باتوں سے دل برداشتہ مت ہو جاؤ۔ تم اپنے پروگرام پر نہایت ثبات و استقامت سے گامزن رہو اور ان عجلت پسندوں، انتشار طلبوں سے حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جاؤ۔ ان سے کہو کہ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ۔ (۶/۱۳۵) تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو۔ مجھے اپنے راستے پر گامزن رہنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ منزل مقصود کس کے حصے میں آتی ہے۔ چنانچہ گرم جوش رہرو، بغیر فکری انقلاب، ہنگامہ آرائیوں کے راستے پر گامزن رہے اور مستحق ہزار تبریک تہنیت ہیں آپ احباب، کہ آپ نے، اس راستے کی ہزار دلفریب جاذبیتوں کے باوجود، اپنی پُرسکون راہ کو نہ چھوڑا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی رہی کہ۔ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔ اور آپ اپنی رفتار سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کی ہنگامہ خیزیوں کی کیفیت یہ تھی کہ:

ہنگامہ خیزیوں کا انجام

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اوّل اوّل - وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اوّل - غبارِ رہِ کارواں آخر آخر

جسے آپ اسوقت کی عالمگیر مایوسی کہہ رہے ہیں، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی ایک ایک تحریک (جسے تحریک نہیں بلکہ حرکتِ مذبوحی کہنا زیادہ صحیح ہوگا) ناکام ہو کر رہ گئی ہے، اور اب انہیں کشادگی کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی، ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اُن میں، گذر گیا میں، ٹھہر گیا وہ

اس وقت ملک میں کوئی جماعت اور پارٹی ایسی نہیں جسے اس گرداب سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی دیتی ہو۔ محرومین ..... کا وہ گروہ جو حزبِ اختلاف کہلاتا ہے، لیکن جو حزب نہیں بلکہ احزاب ہیں، ان کی یاس انگیز ناکامیاں اور نامرادیاں تو ایک طرف، خود صاحبِ اقتدار جماعت بھی کچھ کم، جھنجھلاہٹ کا شکار نہیں۔ ان کا کوئی اصلاحی اقدام وہ نتیجہ پیدا نہیں کر رہا جس کے لئے وہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ وہ بھی قوم کے دل و دماغ میں فکری اور نفسیاتی تبدیلی پیدا کئے بغیر، خارجی اصلاحات کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے، عزیزانِ من! اس پیدا ہونے والی کیفیت کی نشاندہی، آج سے تین سال پہلے، اسی مقام پر، اسی کنونشن (منعقدہ ۱۹۷۱ء میں) اپنے اس خطاب میں کر دی تھی جس کا عنوان تھا۔

تین سال قبل

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں۔

موضوع کی اہمیت اور حالاتِ حاضرہ کی نزاکت کے پیشِ نظر، ضرورت تھی کہ اس خطاب کو پورے کا پورا آپ کے سامنے دوبارہ لایا جاتا، لیکن وقت کی کمی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں اس میں سے صرف دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ میں نے، قوم کے جذبات کو مشتعل کرنے والی ہنگامہ خیز تحریکوں کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ:

> تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں، عقل و فکر کے چراغ بجھا سکنے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلاب بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس نئے مملکتِ پاکستان، جو ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے، ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں قانون شکنی، دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

> خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں گاندھی نے (Quit India) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بیباک چھوڑ دیا، تو اس نے قائد اعظمؒ کو بھی دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید

کیجئے۔ اسکے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھائیے، قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ انگریز کی طرف ہے کل کو اُس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائیگا۔ اُس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہیگا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عمل رقص بسمل پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی۔ لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی "قانون شکنی کے خوگر عناصر" ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے

جو آگ لگائی تھی تم نے اسکو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (LAWLESSNESS) کی زد میں آ رہا ہے۔

اس زمانے میں اتنی بات کے سلسلہ میں ہر طرف نعرہ خیز پراپیگنڈہ۔ انتہائی زوروں پر تھا جس میں سوشلزم کے دعویداروں کی آواز سب سے بلند تھی۔ میں نے اُس تحریک کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا،

اس سے بھی آگے مجھے ایک اور خطرہ نظر آ رہا ہے جس کے تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس معاشی تحریک میں لوگوں کو جس قدر سنہرے خواب دکھائے جا رہے ہیں، اس سے انکے دل میں یہ یقین پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ جونہی ہماری پارٹی برسرِ اقتدار آئی، ہم میں سے ہر ایک کے پاس بنگلہ، موٹر، کارخانہ، سینکڑوں مربعے زمین، چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہونگے۔ اور انہی تصورات کی کشش ہے جو انہیں اس تحریک کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ پارٹی برسرِ اقتدار آ بھی گئی تو عوام کے ساتھ کئے گئے اس قسم کے وعدے کبھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔

مایوس کی سرکشی

ان کا ماتوں رات پورا کرنا کسی کے بس کی بھی بات نہیں ہوگی۔ اس وقت یہ لوگ مایوس ہو جائینگے' اور جب مایوسی (DESPERATE) ہو جائے تو اس کی تباہ کاریاں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب بلی کسی ایسے کمرے میں گھر جائے جس سے باہر نکلنے کے سب راستے مسدود ہوں تو وہ آنکھیں نوچ لیا کرتی ہے۔ علم النفس کی رُو سے مایوسی (FRUSTRATION) کا ردِ عمل شدید قسم کا (AGGRESSION) ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے ابلیس اور شیطان

ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ ابلیس کے معنی ہیں مایوسی اور شیطان کے معنی ہیں سرکشی۔ جب ابلیس شیطان بن جاتا ہے تو قرآن اسے عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ کہہ کر پکارتا ہے ـــــ یعنی تمہارا کھلا ہوا دشمن۔ یہ ہے وہ خطرہ جس کا احساس میری روح پر کپکپی طاری کر دیتا ہے کہ جب یہ لوگ مایوس ہونگے تو ان کے ہاتھوں یہاں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھائے!

آپ نے غور کیا، عزیزانِ من! کہ قوم اسوقت ٹھیک اس مقام پر آگئی ہے جس کی نشاندہی میں نے تین سال پہلے کی تھی۔ اسوقت حالات یقیناً "انتہائی یاس انگیز اور حوصلہ شکن ہیں، لیکن، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ مایوسی اس لئے ہے کہ ملک کی مختلف جماعتوں کو اس بگولے سے باہر نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی حالت یقیناً ایسی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن جو راہرو قرآن کریم کی مشعلِ نورانی سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے، وہ تو کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ ایسے حوصلہ فرسا حالات میں مایوس ہونا تو ایک طرف، اس کے دل میں اُمید کی شمعیں اور بھی زیادہ تابانیوں سے نور پاش ہو جاتی ہیں۔ اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

دل دھڑکتا ہے تو پیغامِ سکوں ملتا ہے ۔ ایک مدت میں یہ اندازِ جنوں ملتا ہے

آپ میرے اس پیغام کو دیکھئے جو میں نے گذشتہ عید کی تقریب پر قوم کو دیا ہے اور جو طلوعِ اسلام کی حالیہ اشاعت (بابت نومبر ۱۹۷۳ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں میں نے بتایا ہے کہ قرآن مجید نے پہلے یہ کہا ہے کہ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۔ (15/56)۔ خدا کی رحمت سے مایوس وہ ہوتا ہے جسے دشتِ بلا انگیز سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملے۔ اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ خدا کی یہ رحمت، جس سے مایوسی کفر ہے، خود قرآن مجید ہے۔ اس نے قرآن کو هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (7/52) کہا ہے، یعنی جو لوگ اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، ان کے لئے یہ کتاب، واضح اور روشن راستہ دکھانے والی ہے، فلہذا رحمت۔ اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ یہ مشعلِ ہدایت ایک راستہ دکھانے پر اکتفا نہیں کرتی۔ سینکڑوں راستے کشادہ کر دیتی ہے۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ۔ (5/16)۔ اس کے ذریعے، خدا، سلامتی کی کئی راہیں سامنے لے آتا ہے۔ اب آپ سوچئے! رفیقانِ ہم سفر! کہ جس مسافر کے سامنے منزل تک پہنچنے کی ہزار راہیں کشادہ ہوں، وہ کبھی مایوس ہو سکتا ہے؟

ہزاروں راستے

اس کیلئے تو یہ تشبیہ جان نواز، قدم قدم پر دلیلِ راہ بنتی جاتی ہے کہ:

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم ۔ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

اگر اس کی کوئی ایک اجتہادی تدبیر کسی وجہ سے ناکام رہ جاتی ہے، تو قرآنی حقائق پر غور و فکر سے اس کے سامنے کئی اور تدبیریں آ جاتی ہیں۔ موضوع کے تسلسل کے پیشِ نظر مجھے اسی طرح آگے بڑھ جانا چاہیئے لیکن اس مقام پر ایک ایسا قرآنی نکتہ سامنے آگیا ہے جس کی وضاحت کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سورہ مائدہ کی جو آیت میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ خدا! متلاشیانِ منزل کے سامنے سُبُلَ السَّلٰمِ، سلامتی کے کئی راستے روشن کر دیتا ہے۔ یوں تو منزلِ مقصود تک لے جانے والا ایک ہی راستہ ہے جسے اس نے صراطِ مستقیم کہہ کر پکارا ہے، لیکن عملی زندگی کی

کیفیت یہ ہے کہ نِت نئے دن نئے نئے مسائل انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں جن کا اُسے حل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے ہر پیش آنے والے معاملہ کا حل دریافت کرنا جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حل زمانے کے تقاضوں اور معاملہ زیرِ نظر کی ضرورتوں کے مطابق، مختلف ہوں گے۔ انہیں اجتہادی تدابیر کہا جائیگا جنہیں قرآن نے سُبُل سے تعبیر کیا ہے۔ سُبُل کا ذکر کرنے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ یَہْدِیْہِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (۵/۱۶)۔ اس طرح خدا، ان کار والوں کو صراطِ مستقیم تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی سُبُل وہ پگڈنڈیاں ہیں جو آخرالامر جاکر صراطِ مستقیم (شاہراہ حیات) میں مل جاتی ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے اپنے غیر متبدل اصول اور تغیر پذیر تقاضوں کے باہمی ربط و تعلق کو، سُبُل اور صراطِ مستقیم کی درخشندہ مثال سے کسطرح واضح کیا ہے۔

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد - بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

اس ضمنی نکتہ کے بعد، آگے بڑھئے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ۔ (۲۹/۲۳)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے اور اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا نتیجہ یقیناً سامنے آکر رہے گا، وہ رحمتِ خداوندی سے مایوس ہوتے ہیں یہاں

فقدانِ یقین

سے ہمارے سامنے وہ حقیقت آجاتی ہے جو معاشرہ کی موجودہ عالمگیر مایوسی کی اصل و بنیاد ہے۔ ہم نے قرآن کو کتاب اللہ (یعنی ضابطہ قوانینِ خداوندی) تسلیم کرتے تھے، زبانی کبھی انکار کیا لیکن ہمیں اس پر کبھی یقین نہیں آیا کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ تباہی اور بربادی، فلہذا ہمہ گیر مایوسی ہوتا ہے۔ ہم نے مملکت کے ہر آئین میں، اس کتاب عظیم کے نام کو نمایاں جگہ دی ہے۔ ہم اٹھتے بیٹھتے اس کا تذکرہ کرتے اور اس کے الفاظ دھراتے رہتے ہیں۔ اس کی تلاوت پر اسقدر زور دیتے، اور اس کے الفاظ کو صحیح طور پر چھاپنے اور پڑھنے کے لئے اسقدر اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت پر قطعاً یقین نہیں کہ یہ ایسے قوانین کا ضابطہ ہے جن کی خلاف ورزی کا لازمی، فطری، ابدی، نتیجہ تباہی ہے۔ یہ ہے ہماری بربادی، تباہی اور مایوسی کا حقیقی سبب۔ اقبالؔ کے الفاظ میں، ہماری حالت یہ ہے کہ

نگہبانِ حرم معمارِ دیر است - یقینش مردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید - کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

حکیم الامتؒ نے اپنی بصیرت افروز اور حقائق پرور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں، قرآنِ مجید کے متعلق ابلیس کی زبان سے یہ کہلوایا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب - یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین

خود فراموشی

پھر، یہ حقیقت بھی بڑی عبرت آموز ہے کہ جب انسان کو قوانین خداوندی کی حکمیت پر یقین نہیں رہتا، اسے خود اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں رہتا۔ وہ خیال کرنے لگ جاتا ہے کہ وہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اسطرح وہ زندگی ہی میں موت سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ یہ جو ہم پر آج اسطرح اجتماعی موت مسلط

ہو رہی ہے اور ہم اپنی لاشوں کو اپنے کندھوں پر لئے لئے پھرتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مایوسی خارجی حالات کی پیدا کردہ نہیں ہوتی، انسان کی اپنی ذات کے امکانات کیطرف سے بے یقینی کا نتیجہ ہوتی ہے علامہ اقبال نے اس حقیقت کو کسقدر مختصر لیکن بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ؛

جانے کہ داوند دیگر نگیرند – آدم بمیرد از بے یقینی

اور، جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے اپنی ذات کے ممکنات کیطرف سے یہ بے یقینی، قانونِ خداوندی کی صداقت سے بے یقینی سے پیدا ہوتی ہے۔ کیسے حسین اور عمیق ہیں سورہ حشر کے یہ الفاظ جن میں ہمیں متنبہ کیا گیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ط۔ (59/19) یاد رکھو! تمہاری کیفیت ان لوگوں کی سی نہ ہو جائے جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے آپ ہی کو بھول گئے۔ یعنی خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہوتا ہے، اور خود فراموشی کا نتیجہ مایوسی۔ اس لئے اقبال نے کہا تھا کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ، خار و خسِ چمن مشو – منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو

اقبال، امیدوں کا شاہزادہ ہے۔ اس کا سارا فلسفہ انسان کو اس کی ممکنات سے آگاہ کرتا ہے۔ اسی کو وہ خودی کہکر پکارتا ہے۔ وہ اسے جھنجھوڑ کر کہتا ہے کہ:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو + قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو + دیکھ تو، پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ + تو اگر سمجھے تو، تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

خداشناسی اور خود آگاہی کی یہی وہ تعلیم ہے جس کے متعلق میں پہلے دن سے پکارتا چلا آ رہا ہوں کہ اسے اپنی درسگاہوں کے نصاب کا مرکز قرار دو، لیکن کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا اور ہماری نئی نسل غلط تعلیم کے ہاتھوں بے راہ رو ہوتی چلی گئی۔ جس قوم سے ہم آج اس طرح نالاں ہیں یہ انہی بچوں پر مشتمل ہے جو تشکیل پاکستان کے وقت دبستانوں میں زیر تعلیم تھے۔ اگر ان کی تعلیم صحیح خطوط پر ہو جاتی تو ان میں وہ فکری اور نفسیاتی انقلاب پیدا ہو جاتا جس پر قوموں کی تعمیر کا دار و مدار ہوتا ہے۔ میں نے جب بھی نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی بات کی تو یہی اعتراض دھرایا گیا کہ یہ راستہ بہت لمبا ہے۔ آپ سوچئے، عزیزانِ من! کہ جو مسافر آغازِ سفر میں یہ کہکر سرِ راہ بیٹھ جائے کہ راستہ بہت لمبا ہے، وہ کبھی منزل تک پہنچ سکتا ہے؟ اگر وہ چلنا شروع کر دے تو اس کا ہر قدم فاصلہ کو کم کرتا چلا جائے گا۔ اگر ہم سرِ راہ بیٹھ کر راستہ کی لمبائی کا رونا رونے رہتے اور اٹھ کر چل پڑتے، تو اس چھبیس سال کے عرصہ میں ایک ایسی قوم تیار ہو جاتی جو ہماری دنیا بدل دیتی۔

ہماری حرماں نصیبی یہی تو نہیں کہ ہم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا اور غلط راستے کی ایک ایک تدبیر ناکام ہو کر رہ گئی۔ ہماری اس سے بڑھ کر شوریدہ بختی یہ ہے کہ اسقدر ناکام تجارب کے بعد بھی ہماری نگاہ صحیح راستے کیطرف نہیں اٹھتی۔ ہم اب بھی کسی (SHORT CUT) ہی کے متلاشی ہیں — شارٹ کٹ ہی کے نہیں بلکہ کسی معجزہ کے، کیونکہ خیال یہ ابھر رہا ہے کہ اب ہماری ہلاکت کے دن بہت قریب آ گئے ہیں۔ ہماری مہلت کا وقفہ ختم ہو رہا ہے۔ اب ہمارے پاس وقت نہیں کہ ہم سوچ سمجھ کر کوئی سلامتی

کی صورت پیدا کر سکیں۔ اس لئے اب ہمیں کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ ہماری یہ مضطربانہ بیقراری بجا اور درست، لیکن اس کا کیا علاج کہ قوموں کو خارقِ فطرت معجزات نہیں بچایا کرتے۔ جس خالقِ فطرت کی طرف سے ہم کسی معجزہ کی توقع کرتے ہیں، اس نے تو واضح الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط (۸/۴۲) نہ قوموں کی ہلاکت یونہی اتفاقی اور ہنگامی طور پر ہوتی ہے نہ ہی انہیں زندگی اتفاقی اور ہنگامی طور پر مل سکتی ہے۔ ان کی ہلاکت بھی علیٰ وجہ البصیرت (RATIONALLY) ہوتی ہے، اور زندگی بھی اسی طریق سے مل سکتی ہے۔ اور علیٰ وجہ البصیرت زندگی ملنے کا طریقہ وہی ہے جس سے میں نے آغازِ سخن کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (۱۳/۱۱) کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی جب تک وہ قوم اپنے اندر ذہنی اور نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کر لیتی۔

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے۔ نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

سوال سارا یہ ہے کہ ہمیں قرآن کے ان ابدی اصولوں کی صداقت پر یقین ہے یا نہیں۔ اگر یقین ہے تو پھر ہمیں کسی اور راستے کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ اور اگر یقین نہیں تو پھر اس بے یقینی کی سزا بھگتنی چاہیئے۔ اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قوانینِ خداوندی کی یہ صورت نہیں کہ اگر ہمیں ان کی نتیجہ خیزی پر یقین ہو تو یہ اپنے نتائج مرتب کریں گے اور اگر اس پر یقین نہ ہو تو ان کے نتائج برآمد نہیں ہونگے۔ قطعاً یہ صورت نہیں۔ ہمیں یقین ہو یا نہ ہو، یہ اپنے نتائج بہرحال مرتب کر کے رہینگے۔ ہم آگ کی تپش و حرارت پر یقین رکھیں یا نہ رکھیں۔ اگر ہم اس میں اپنی انگلی ڈال دینگے تو وہ اسے بہرحال جلا دیگی۔ قوانینِ خداوندی ہمارے کفر و ایمان سے مستغنی ہیں۔ کفر و ایمان کا اثر ہماری ذات پر پڑتا ہے، قوانینِ خداوندی پر نہیں۔ اگر ہم ان کی نتیجہ خیزی پر ایمان رکھیں گے تو ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے بچ جائیں گے۔ اگر اس سے انکار کریں گے تو تباہ ہو جائینگے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۷) قوانینِ خداوندی کی نتیجہ خیزی سے انکار کرنے والے یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اسطرح ان قوانین کو شکست دے سکینگے۔ قطعاً نہیں۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ط (۲۴/۵۷) اس کے برعکس وہ اپنے اس انکار سے ان کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ ہم نے خدا کے اس ابدی، غیر متبدل اصول (کہ نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، قوموں میں اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی) کی صداقت سے انکار کر کے دیکھ لیا کہ ہم پر کسطرح ہلاکت مسلط ہو گئی۔ اگر ہم اب بھی اس انکار کو یقین کے ساتھ بدل کر، اس کے مطابق اپنی روش اختیار نہیں کریں گے، تو یہ ہلاکت ابدی ہو جائیگی۔ باقی رہے، زمیلانِ قوم! ہم جو پہلے دن سے اس پکار کو عام کر رہے ہیں، تو جو صورت یہاں پیدا ہو رہی ہے اس سے ہمارے ایمان میں اور پختگی پیدا ہو جانی چاہیئے کہ پہلے۔ ہمارا جو ایمان بالغیب تھا، وہ اب بالشہادۃ ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنی دعوت کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی قوم کے شریکِ حال نہیں۔ ہم اسی قوم کے افراد ہیں اس لئے جو مقدر اس کا ہے وہی ہمارا ہے۔ اس کی خوشی ہماری خوشی اور اس کا غم ہمارا غم ہے۔ ہم اسی درخت کی شاخیں اور اسی پیڑ کے پتے ہیں۔ اگر یہ خشک ہو

ہم اس قوم کے فرد ہیں

جائیگا تو ہم کب سرسبز و شاداب رہینگے، اور اگر یہ (خدانخواستہ) جڑ سے اکھڑ گیا تو ہم کیسے سلامت رہ سکینگے؟ ویسے بھی، قرآن کریم نے اجتماعی تباہی کے متعلق پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (۸/۲۵) تم اُس تباہی سے بچنے کی تدبیر کرلو کہ جب وہ آتی ہے تو صرف وہی لوگ اس کی لپیٹ میں نہیں آیا کرتے جنہوں نے ظلم و زیادتی کی ہوتی ہے۔ اس کی لپیٹ میں ساری کی ساری قوم آجایا کرتی ہے۔ یاد رکھو! قانونِ خداوندی کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس تمام تنذیر و تذکیر کے بعد، جس کی رُو سے میں نے آپ احباب کی توجہ قوم کی اس بنیادی غلطی کیطرف مبذول کرائی ہے جو ہماری سوختہ سامانیوں کی علت العلل ہے، ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ خطرہ جو اسوقت ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے، اس سے محفوظ رہنے کی کیا تدبیر ہے؟ یہ خطرہ، اس مایوسی کا پیدا کردہ ہے جو اسوقت ہمارے پورے کے پورے معاشرہ کو محیط ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے۔ یہ جب کسی معاملہ کی تائید میں اٹھتی ہے تو اسے آسمان تک چڑھا دیتی ہے اور جب اس کے خلاف جاتی ہے تو اسے تحت الثریٰ تک پہنچا کر بھی دم نہیں لیتی۔ اعتدال ان کے ہاں نہ اُسوقت ہوتا ہے نہ اِس وقت۔ یہ، نہ عقل و فکر کی رُو سے اُسوقت معاملہ زیرِ نظر کا جائزہ لیتی ہے، نہ اُسے دلیل و برہان کی رُو سے اس وقت پرکھتی ہے۔ آیئے ہم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ قوم کا مصیبت کیا ہے۔ اس کے اسباب کیا اور حل کیا۔

آج حالت یہ ہے کہ آپ جس شخص سے ملیئے وہ باصد آہ و فغاں کہیگا کہ صاحب! موجودہ برسراقتدار پارٹی نے ملک کو ایسا تباہ کر دیا ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد وہ اس طبقہ کے عیوب و اسقام ایک ایک کرکے گنانا شروع کر دیگا اور مقطع کا بند یہ ہوگا کہ ان کی اصلاح بھی ناممکنات میں سے ہے، اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی ناممکنات میں سے۔ اس لئے اب مرگ مفاجات کے سوا ہمارا انجام کچھ نظر نہیں آتا۔

دیکھو جرم کس کا ہے

آپ کو معلوم ہے، عزیزانِ من! کہ میرا تعلق کسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی میں (یا تحریک طلوع اسلام) عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لئے، میں اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کرونگا کہ ان الزامات میں حقیقت کسقدر ہے اور مبالغہ کسقدر۔ میں، ان الزامات عائد کرنے والوں کی کسی بات کو چیلنج کئے بغیر، ان سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ جن کے خلاف آپ اسطرح شکایات کے دفتر کھول رہے ہیں، ہیں کون اور آئے کہاں سے ہیں؟ جواب واضح ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں ان (شکایت کرنے والوں نے) تین سال پہلے اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا! آپ کو معلوم ہے کہ نمائندہ کسے کہتے ہیں؟ نمائندہ سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص میرا قائم مقام ہے۔ اس کی ہر بات میری بات، اس کا ہر فیصلہ میرا فیصلہ، اور اس کا ہر عمل میرا عمل متصور ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص کے نمائندہ کی کوئی حرکت معیوب، یا اس کا کوئی فیصلہ مضرت رساں ہوگا، تو اس کی ذمہ داری اس شخص پر عائد ہوگی جس نے اسے اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔ لہٰذا، ملک کے یہ کروڑوں افراد جو اپنے نمائندوں کے خلاف

یہ کچھ کہتے ہیں، اس کا الزام اپنے سر کیوں نہیں دھرتے! قوم ان سے پوچھنا چاہتی ہے کہ آپ کے ووٹ دینے سے پہلے یہ حضرات کونسے اقتدارات کے مالک تھے۔ انہیں یہ اختیارات تم ہی نے دیئے۔ انہیں ان اقتدارات کا مالک تم ہی نے بنایا۔

انہیں تو، تو کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ جناب تم نے بنایا، حضور تم نے کیا۔

اب اگر ان کے ہاتھوں، بقول تمہارے، تم ہی نہیں بلکہ ساری قوم مصائب و آلام کا شکار ہو رہی ہے، اور ملک کا مستقبل تک خطرہ میں نظر آتا ہے، تو ان عواقب سے تم کب بری الذمہ قرار پا سکتے ہو! اس کے لئے، مملکت خود تمہارا گریباں پکڑنے میں حق بجانب ہو گی۔

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ صاحب! ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ ایسے ثابت ہوں گے؟ آپ غور کیجئے کہ اس جواب میں ذمہ داری سے فرار کی کسقدر ناکام کوشش جھلک رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہیں مریخ سے تو ٹپک نہیں پڑے تھے۔ یہیں آپ کے ماحول میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے۔ یہیں بڑے ہوئے۔ ان کا سارا ماضی آپ کے سامنے تھا۔ کیا اس سے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں اور کیسے ثابت ہوں گے؟ یہ تو باور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ساری عمر نہایت دیانتدار، قابل اعتماد، نیک کردار، پاکیزہ سیرت رہے ہوں، اور منتخب ہونے کے ساتھ ہی، شباشب، ایسے بدل گئے ہوں کہ سر سے پاؤں تک خرابیوں کا مجموعہ بن گئے ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص آپ سے پہلی بار ملے اور آپ اس کی باتوں میں آ کر فریب کھا جائیں اور اس کے بعد جب اس کی اصلی صورت سامنے آئے تو آپ کو بصد تاسف کہنا پڑے کہ

زلف آوارۂ گریباں چاک۔ اومست شباب۔ تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

لیکن جن لوگوں نے آپ کے درمیان زندگی بسر کی ہو ان کے متعلق تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ نبی اکرمؐ نے کسی شخص کے کیریکٹر کے متعلق صحیح اندازہ لگانے کا یہی معیار بیان فرمایا تھا جب اپنی قوم سے کہا تھا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (۱۰/۱۶) میں نے اس سے قبل تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو تو اس سے یہ بات سمجھ میں آ جائیگی کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ میرا کردار کس قسم کا ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ ہم نے ان کے ماضی کے متعلق کوئی تحقیق نہیں کی تھی، تو یہ اس سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ ایک شخص کو آپ اپنا نمائندہ منتخب کر رہے ہیں۔ یعنی اسے اپنے سیاہ و سفید کا مالک قرار دے رہے ہیں، اور اس کے متعلق اتنا بھی معلوم نہیں کرتے کہ وہ ہے کس قماش اور کردار کا انسان! آپ نے غور کیا، برادران عزیز! کہ معاشرہ کی جن یاس انگیز خرابیوں کی یہ لوگ اسقدر شکایت کرتے ہیں، ان سے یہ خود بھی کسی صورت بری الذمہ قرار نہیں پا سکتے!

سیاسی شعور کا فقدان

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں نہ کسی کو الیکشن کی اہمیت کا احساس ہے، نہ ووٹ کی قیمت کا اندازہ۔ الیکشن کو ہمارے ہاں ایک میلہ سمجھا جاتا ہے۔ باقی رہے ووٹ۔ سو جس پارٹی کا پروپیگنڈہ زیادہ وسیع، شدید اور منظم ہو، اسے زیادہ ووٹ مل جاتے ہیں جہاں

کے اس سیلِ بے پناہ میں کسی کو اس کا ہوش ہی نہیں ہوتا کہ وہ امیدوار کی سیرت کو جانچے اور پارٹی کے کردار کو پرکھے۔ وہ ووٹرز، یہ سب کچھ (گویا) نشہ کی حالت میں کر گذرتے ہیں، اور جب نشہ اتر جاتا ہے تو رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ گذشتہ یومِ آزادی (۱۴ اگست ۱۹۷۳ء) کی تقریب پر میں نے اپنے خطاب میں (جس کا عنوان تھا۔ کیا ہم آزاد ہیں) مغربی نظامِ جمہوریت کا تجزیہ کر کے بتایا تھا کہ یہ نظام کسقدر خرابیاں پیدا کرنے کا موجب ہے، اور خود مغرب کے سیاستدان اور مفکر بھی اس کے ہاتھوں کسقدر تنگ آ چکے ہیں۔ اس ضمن میں میں نے، شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر (ALAN GEWIRTH) کا ایک اقتباس پیش کیا تھا، جسے اس مقام پر دھرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

> اس نظام میں پبلک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت مؤثر پارٹیاں اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو نظریہ جمہوریت جوشِ خطابت کا پیدا کردہ افترا ہوتا ہے جس میں صداقت۔ نیکی۔ اور حسنِ عمل کے الفاظ ایسے حربے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ پارٹیاں میدانِ کارزار یا مارکیٹ میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ (SOCIAL JUSTICE)

جب جمہوری نظام کی یہ کیفیت اُن اقوام میں ہے جو سیاست میں منجھی ہوئی ہیں، تو ہمارے جیسے ملک میں جس میں سیاسی شعور کی ہنوز ابتدا بھی نہیں ہوئی، یہ جس قسم کے نتائج مرتب کر سکتا ہے، ظاہر ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں جمہوری نظام پر ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ کے نظام کو ترجیح دیتا ہوں۔ صحیح نظام تو جمہوری ہی ہو سکتا ہے جسے قرآن مشاورتی نظام کہہ کر پکارتا ہے، لیکن وہی جمہوری نظام جس پر حدود اللہ کا کنٹرول ہو (چونکہ اس کنونشن میں میرے ایک خطاب کا موضوع یہی ہے کہ سیکولر حکومت اور اسلامی نظام میں فرق کیا ہے) اس لئے میں اس نشست میں اس اجمال کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں پھر اس سوال کی طرف آنا چاہتا ہوں کہ جب (ان شکایت کرنے والوں کے الفاظ میں) ان کے منتخب کردہ نمائندے ان کی توقعات پر پورے نہیں اترتے اور اس کی وجہ سے معاشرہ میں اسقدر خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، تو اس کا علاج کیا کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں، ان سے عرض کرونگا کہ آپ نے جس جمہوری نظام کو قبول کر رکھا ہے اس میں یہ شرط بھی موجود ہے کہ آپ ان نمائندوں کو پانچ سال کے لئے منتخب کر رہے ہیں۔ انہیں، اس مدت سے پہلے، مسندِ اقتدار سے الگ کرنے کی ایک ہی صورت تھی، اور وہ یہ کہ پارلیمان کی اکثریت، ان کے خلاف عدمِ اعتماد کی قرارداد منظور کر دے۔ لیکن جب پارلیمان میں اکثریت انہی کی ہو، تو یہ طریقِ کار غیر مؤثر ہی نہیں، بیکار محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس بھنور سے نکلنے کے لئے جو طریقِ عمل حزبِ اختلاف تجویز اور اختیار کرتی ہے وہ خود ان کے اپنے تسلیم کردہ مسلک کے خلاف ہوتا ہے یہ لوگ جمہوری نظام تسلیم کرنے کے بعد، فریقِ مخالف کو اقتدار سے الگ کرنے کے لئے غیر جمہوری طریق اختیار کرتے ہیں جس کا نتیجہ مزید انتشار اور خلفشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد بھی درحقیقت اصلاح نہیں ہوتا۔ یہ اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں) جب انہی حضرات نے ۱۹۶۵ء میں بحالیٔ جمہوریت کے نام پر غیر جمہوری طریقے اختیار کئے تھے، تو میں نے ان کی خدمت میں گذارش کیا

بھانکر شورش انگیزی اور انتشار خیزی کی تلوار دو دھاری ہوتی ہے۔ آج جسطرح آپ اسے فریق مقابل کے خلاف استعمال کر رہے ہیں، کل کو یہ اسی طرح آپ کے خلاف استعمال ہو سکتی ہے، اس لئے اسے زیر نیام رہنے دیجئے۔ اس میں آپ کا بھی بھلا ہے اور ملک کا بھی۔ میں یہی گذارش ان کی خدمت میں آج بھی کرونگا کہ وہ جمہوریت کے نام پر اس قسم کے غیر جمہوری طریقے استعمال نہ کریں۔

میں عوام سے یہ عرض کرونگا کہ جب آپ ان نمائندوں کو پانچ سال کے لئے منتخب کر چکے ہیں، اور اس سے پہلے انہیں الگ کرنے کی کوئی جمہوری شکل نظر نہیں آتی، تو آپ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتئے اور اس کے نتائج و عواقب کو صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کیجئے۔ اور اس سے یہ سبق سیکھئے کہ آپ آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ آپ اگر ایک الیکشن میں غلطی کر گئے ہیں تو اس سے آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ تو نہیں ہو گئے۔ اس

آئندہ الیکشن

سے آپ کے تمام (CHANCES) ضائع نہیں ہو گئے۔ الیکشن تو پھر بھی ہونگے۔ آپ مایوس ہو کر بیٹھ جائیں، یا تخریبی کاروائیوں پر اتر آنے کے بجائے، اپنے آپ کو یہ کہکر کیوں نہیں سمجھا لیتے کہ

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے ۔ لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔

آپ اپنے آپ کو ابھی سے آئندہ الیکشن کے لئے تیار کرنا شروع کر دیجئے۔ اور وہ اسطرح کہ آپ اپنے ماحول کو گہری نظروں سے چھانٹئے اور دیکھئے کہ اس میں کون کون سے ایسے لوگ ہیں جن کا ماضی بے داغ ہے۔ جن کا کردار پاکیزہ ہے۔ جو معاملات کے سچے اور ستھرے ہیں۔ جو بات کے پکے ہیں جن پر ہر طرح سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یاد رکھئے۔ قوم ایسی بانجھ نہیں ہو گئی کہ آپ کو اپنے حلقۂ نگاہ میں دو چار افراد بھی ایسے نہ مل سکیں خاموشی ہی خاموشی سے ایسے افراد کی گفتار، رفتار، کردار پر ناقدانہ نظر رکھئے۔ اگر وہ آپ کے معیار پر پورے اتر آئیں تو ان کے متعلق اور لوگوں کی رائے بھی معلوم کیجئے۔ اگر آپ نے اس طریق کار کو تسلسل سے جاری رکھا تو الیکشن کے قریب آپ کی نگاہوں میں ایسے افراد آ جائینگے جو آپ کے حلقۂ انتخاب میں، آپ کے معیار کے مطابق قابل اعتماد تصور کئے جائیں۔ ان لوگوں کو نامزد کیجئے اور اس کی احتیاط برتئے کہ آپ نہ تو پراپیگنڈہ کے سیلاب میں بہ جائیں اور نہ ہی تخویف و ترہیب کا کوئی حربہ آپ پر کارگر ہو سکے۔ اگر آپ نے آئندہ الیکشن کے لئے ان خطوط پر ذہنی تیاریاں شروع کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی الیکشن کے بعد، اس ملک کی کسطرح کایا پلٹ جاتی ہے۔ جب پارلیمان میں ایسے منتخب شدہ اراکین کی اکثریت ہو جائے تو پھر آئین پاکستان میں اس قسم کی ترمیم کیجئے جس سے غلط نمائندوں کو، ان کی مدت رکنیت سے قبل، الگ کر دینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور مملکت کا تمام کاروبار قرآنی حدود کے اندر طے پاتا رہے۔ اسوقت یہ مملکت بھی اسلامی کہلا سکیگی اور ہمارا معاشرہ بھی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا فردوس بداماں آئینہ دار ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کے لئے تبدیلیٔ احوال کے تمام راستے بند نہیں ہو گئے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے۔

یہ ہے، عزیزان من! موجودہ مایوسیوں کی ہر لمحہ تاریکیوں سے نکلنے کا راستہ جس تک بحالات موجودہ میری بصیرت مجھے

پہنچاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ ـــــ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود۔ آپ تین سال کے بعد مرض کا علاج تجویز کرتے ہیں اور اگر اس وقت تک یہ ملک ہی باقی نہ رہا، تو پھر آپ کیا کریں گے؟ آپ ایسے حضرات سے کہیے کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی اس سے بہتر علاج ہو تو فرما دیجئے۔ لیکن آپ اتنا دیکھ لیجئے گا کہ ان کا تجویز کردہ علاج، شیخ سعدیؒ کی اس حکایت کے مماثل نہ ہو جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ایک بکری نے اپنے سینگ، ایک دیوار میں گڑی ہوئی ہنڈیا میں پھنسا لئے۔ پھنسا تو آسانی سے لیئے لیکن ان کا نکالنا دشوار ہو گیا۔ گاؤں کے سیانے سے پوچھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور انتہائی سوچ بچار کے بعد کہا کہ یوں کرو کہ اس دیوار کو گرا دو۔ دیوار گرا دی گئی تو ہنڈیا دیوار سے باہر آ گئی لیکن بکری کا سر بدستور اس کے اندر رہا۔ اس نے کہا کہ اب بکری کا سر اس کے دھڑ سے الگ کر دو۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی لیکن اس کا سر پھر بھی ہنڈیا کے اندر ہی رہا، تو اس پر دانائے روزگار نے کہا کہ اب ہنڈیا پھوڑ دو۔ سر باہر نکل آئے گا۔ لہٰذا آپ یہ دیکھ لیجئے گا کہ علاج اس قسم کا نہ ہو۔ یہ وارننگ میں نے اس لئے ضروری سمجھی ہے کہ آج کل ملک میں اس قسم کے نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی کمی نہیں۔

اربابِ اقتدار کی خدمت میں

اب میں چند الفاظ، ملک کے برسرِ اقتدار طبقہ کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ:

اثر کرے نہ کرے، سن تو لے میری فریاد

اور اس فریاد میں، مملکت کے محترم وزیرِ اعظم میرے اوّلین مخاطب ہیں۔ میں نے اس فریاد کو ضروری اس لئے سمجھا ہے کہ حکومت کے بیشمار ذرائع اطلاعات اور بے حساب اسبابِ ابلاغ کے باوجود، میرا اندازہ یہ ہے کہ ملک کے صحیح حالات آپ کے کانوں تک نہیں پہنچ رہے۔ اس کے اسباب کچھ بھی کیوں نہ ہوں، اس وقت حالت یہ ہے کہ مایوسی، عدمِ اطمینان اور مستقبل کے متعلق غیر یقینی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا ہے اور قوم میں شاید ہی کوئی ذی احساس ایسا ہو جو سکھ کی نیند سوتا ہو۔ جب کسی ملک میں ایسے حالات عام ہو جائیں تو اس کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں ہوتا۔ مایوسی اکثر اوقات سرکشی کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ اسے قوت سے دبا دیا جائے۔ اس سے وہ اور شدت سے ابھرتی ہے۔ اس کا صحیح علاج اُن اسباب و علل کا ازالہ ہے جن سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ کے رفقائے کار میں ایسے مشیروں کا فقدان نہیں تو کمی ضرور ہے جو ٹھنڈے دل سے ان اسباب و علل کا جائزہ لیکر، ان کے ازالہ کی مؤثر تدابیر اختیار کرنے کا سوچ سکیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ تخریب کا علاج تخریبی کارروائیاں نہیں ہوتیں۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔ تخریب کا علاج یہ ہے کہ اس سے زیادہ مؤثر تعمیری اقدامات اختیار کئے جائیں۔ قوت کے بے محابا استعمال سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور نفرت کا عام ہو جانا، قوموں کی زندگی میں صحت مندانہ علامت نہیں ہوتی۔ مجھے اس جرأتِ عرض سے معذور سمجھا جائے کیونکہ اگر میں منافقت یا مداہنت سے کام لوں گا تو خدا کے حضور بدترین مجرم قرار پاؤنگا کہ اس وقت ملک کے مختلف گوشوں سے اس قسم کی آوازیں عام طور پر سنائی دیتی ہیں کہ

فلک نے اُن کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں + خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے۔

حکومتوں کا قیام اور مملکتوں کا استحکام، روشِ بندہ پروری کا رہینِ کرم ہوتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

بہ ملازمانِ سلطان خبرے دہم ز رازے ۔ کہ جہاں تواں گرفتن، بہ نوائے دلنوازے

آپ، اور آپ کے رفقائے کار، "نوائے دلنواز" کی روشِ بندہ پروری اختیار کریں اور پھر دیکھیں کہ وہی قوم جس کے دل سے اس وقت نفرت کے چشمے ابلتے ہیں، کس طرح آپ کے پاؤں نہیں چوم لیتی۔

اس فقیرِ بے نوا کے نزدیک اسی روش میں مملکت کا بھی بھلا ہے، اور خود آپ کا بھی۔

ہاں! بھلا کر۔ تیرا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے۔

یہ استحکامِ حکومت اور بقائے مملکت کا محض ہنگامی اور عارضی طریق ہے۔ اس کا مستقل طریقِ کار وہی ہے جس سے میں نے شروع میں بحث کی ہے۔ یعنی قلب و نظر کی تبدیلی۔ اور یہ تبدیلی تعلیم کے سوا ممکن نہیں۔ ہماری قوم کی خرابیوں کی بنیادی اور اصولی وجہ ہمارے نظامِ تعلیم کی خرابی ہے۔ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قوم اُس اسّی (۸۰) فیصد آبادی پر مشتمل ہے جسے عوام کہہ کر پکارا جاتا ہے، اسی لئے باقی بیس فیصد

تعلیم

آبادی جسے تعلیم یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے، قوم کا قلیل ترین حصہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام وہ مسالہ (MATERIAL) ہوتا ہے جس سے قوم صورت پذیر ہوتی ہے۔ اس خام مسالہ کو قالب، قوم کا تعلیم یافتہ، دانشمند طبقہ (INTELLIGENTSIA) عطا کرتا ہے۔ قوم اسی ہیکل میں ڈھل جاتی ہے جس میں یہ دانشمند اسے ڈھالنا چاہیں۔ ہم نے اپنے نظامِ تعلیم کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا تو اس سے دانشور طبقہ بگڑا۔ اور اس طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑ گئی۔ موجودہ حکومت نے اسکولوں اور کالجوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ اس سے نظم و نسق کی کوئی اصلاح ہو تو ہو، نفسِ تعلیم میں اس سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ اصلاح طریقِ تعلیم کے بدلنے سے ہوگی۔ طریقِ تعلیم کی تبدیلی سے بھی یہ مراد نہیں کہ آپ اسکولوں میں ناظرہ قرآن شریف پڑھانے لگ جائیں اور کالجوں میں اسلامیات کا مضمون داخلِ نصاب کر دیں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تعلیم میں بنیادی تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ آپ جو نصاب جی چاہے تجویز کر دیں لیکن اسے پڑھایا اس طرح جائے کہ طالب علموں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے جس سے وہ قرآنی اقدار کی روشنی میں، غلط اور صحیح میں فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے جس کی ابتدا کرنے کے لئے میں ایک مدت سے کوشاں ہوں۔ اب میں آگے بڑھتا ہوں۔

―――――― (٥) ――――――

علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک ۔ ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

مشرقِ وسطیٰ

ہمارا سفینہ ابھی بحرِ بیکراں تک تو نہیں پہنچ سکتا، لیکن میں راوی سے آگے بڑھ کر نیل و فرات تک ضرور پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ نیل و فرات کے میدان پچھلے دنوں جس حادثۂ کبریٰ کی آماجگاہ بنے ہیں، دیدۂ عبرت اس پر صدیوں تک خونفشاں رہے گا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے، مصر گذشتہ ماہ جس عقابی شان سے جھپٹا تھا اس سے وہ ساری دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔

پھر اس کی اس للکار کے ساتھ مختلف عربی ممالک نے جس جرأت و بیباکی سے ہم نوائی کی، اس سے ہمارے حوصلے بلند ہو گئے تھے کہ شاید ملت مرحومہ کی بازآفرینی کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ یہ تصورِ امت کے درخشندہ مستقبل کا دیباچہ نظر آتا تھا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد جنگ کی صورت حال نے جو پلٹا کھایا، اور بڑی طاقتوں نے جس انداز سے وہاں جنگ بند کرائی، اس سے یہ تمام حسین تصورات ایک بار پھر خواب پریشان بن کر رہ گئے۔ چونکہ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہو گا کہ بساطِ سیاست کی ان مہرہ بازیوں کا انجام کیا ہو گا، اس لئے میں ان تفاصیل سے صرفِ نظر کرکے، ایک اصولی نکتہ کو سامنے لانے پر اکتفا کروں گا۔ مسلمانوں کی ہر شکست کے بعد، خواہ وہ رزم میں ہو یا بزم میں، یہ آوازیں چاروں طرف سے اٹھنی شروع ہو جاتی ہیں کہ ہمیں امریکہ نے دھوکا دیا، ہم سے روس نے غداری کی۔ برطانیہ عہد فراموش ثابت ہوا۔ بھارت اپنے وعدوں سے پھر گیا۔ وقس علی ھذا۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن ایسے مواقع پر میری زبان پر بے اختیار علامہ اقبالؒ کے وہ چار الفاظ آ جاتے ہیں جو نوائے سروش کمان سے چالیس سال ہوئے کہلوائے تھے کہ:

مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے۔

اور وہ گلہ یہ ہے کہ آپ، اور تو ہر گوشے سے استصواب کر لیتے ہیں، لیکن آپ نے کبھی قرآن مجید سے بھی پوچھا ہے کہ ان اقوام کے ساتھ تعلقات کس قسم کے رکھنے چاہئیں اور ان پر بھروسہ کس حد تک کرنا چاہئے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ (۵/۵۱)

اے وہ جو قرآنی صداقتوں پر یقین رکھتے ہو، تم یہود اور نصاریٰ کو کبھی اپنا دوست نہ سمجھو۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں، تمہارے دوست کبھی نہیں ہو سکتے۔ تم میں سے جو بھی، اس تنبیہ کے باوجود، ان سے دوستداری کے تعلقات رکھیگا، اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں بلکہ انہی (یہود و نصاریٰ) میں ہو گا۔ یاد رکھو! خدا کا قانون یہ ہے کہ اس قوم پر فلاح کی راہ کبھی نہیں کھلتی جو ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھتی۔

یہود و نصاریٰ کی تخصیص کے بعد اس نے تمام غیر مسلموں کے متعلق کہا۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۔ (۳/۲۸)

قرآن کی صداقتوں پر ایمان رکھنے والے کبھی کسی غیر مسلم کو اپنا دوست نہیں بناتے۔ جو ایسا کرے گا اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے بعد خدا کے ساتھ اسکا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ تمہیں چاہیئے کہ ان کی سازشوں سے بچنے کے لئے پوری پوری حفاظتی تدابیر اختیار کرو، اور قوانینِ خداوندی

کی خلاف ورزی کے نتائج سے ہمیشہ محتاط رہو۔

اسی سورہ میں چند آیات آگے چل کر کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (۳/۱۱۸) اے ایمان رکھنے والو! اپنوں کے سوا کسی غیر کو اپنا رازداں نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تنبیہات میں مخاطب اُن لوگوں کو کیا ہے جو قرآن کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہم جو یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلموں پر بھروسہ کر لیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں قرآن کی صداقتوں پر یقین نہیں رہا اور یہ حقیقت ہے۔ ہم یا تو اس کتاب کے ساتھ یونہی رسمی سی نسبت رکھے ہوئے ہیں، اور یا محض بغرض حصولِ ثواب اس کی تلاوت کر لیتے ہیں۔ ہم زندگی کے معاملات میں نہ اس سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں، اور نہ ہی اس کے قوانین کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ مسلم اقوام کے سامنے کوئی فیصلہ طلب معاملہ آیا ہو، اور انہوں نے مل بیٹھ کر سوچا ہو کہ قرآن مجید اس باب میں ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس سے ہمیں دوہری سزا ملتی ہے۔ ایک تو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی سزا۔ یعنی اس کے فطری ہلاکت آمیز نتائج۔ اور دوسرے، اسلام کے ساتھ اپنی نسبت کی سزا۔ یہ دوسری بات تھوڑی سی وضاحت چاہتی ہے۔ صدرِ اوّل سے لیکر (کم از کم) صلاح الدین ایوبیؒ کے زمانہ تک، یہود اور نصاریٰ اور دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کا ٹکراؤ رہا۔ اس ٹکراؤ میں غیر مسلموں کو عبرت انگیز اور المناک شکستیں ہوئیں اور انہوں نے ناقابلِ تلافی نقصان اٹھائے۔ اس سے ان کے دلوں پر ایسے گہرے زخم لگے جو آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔ یہ قومیں، مسلمانوں سے اپنی عبرتناک شکستوں کا انتقام لینے کے لئے ہمیشہ مضطرب و بیقرار رہتی ہیں۔ جن مسلمانوں کے ہاتھوں انہیں یہ زخم لگے تھے، نہ وہ مسلمان رہے، اور نہ ہی بعد میں آنے والے مسلمانوں میں وہ حرارتِ ایمانی، لیکن ان غیر مسلم انتقام جو قوموں کو اس سے غرض نہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہیں اور ان سے انتقام لینے کی فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں رہتی ہیں۔ اسلام کیطرف ہماری یہ نسبت ہے جو ہمیں ان کا ہدفِ انتقام بنائے رکھتی ہے۔ اس سے ہماری سوختہ بختی واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ اسلام پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ہم اسلام کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم ہیں، اور اسلام کی طرف نسبت رکھنے سے غیر مسلموں کے ناوکِ انتقام کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ یہ ہے وہ دوہرا عذاب جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں۔ اسرائیل، امریکہ، روس اور دیگر اقوامِ مغرب، عربوں کی جان کے دشمن ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ بھارت ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور خدا کا قانونِ مکافات ہمیں موردِ عذاب قرار دیتا ہے کہ ہم اسلام کیطرف نسبت رکھتے، لیکن اس کے مطابق عمل نہ کرنے سے اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ دین کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس کی رسوائی کا باعث بن رہے ہیں۔ اور یہ عدالتِ خداوندی میں سنگین تریں جرم ہے۔ ہم اسی جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را۔

ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے۔ اسوقت چین، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی وجہ

یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ستر اسی کروڑ آبادی فکری اور نظری طور پر ہم آہنگ اور یک رنگ ہے۔ اس سے وہ قوم ایسی "بنیانِ مرصوص" ایسی محکم چٹان بن گئی ہے کہ مخالفت کا بڑے سے بڑا طوفان بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چین کی مثال کے بعد آپ اپنی طرف آئیے۔ مسلمانوں کا ایک بحر بیکراں ہے جو مراکش سے انڈونیشیا تک موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ چین سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ جہاں تک فکری اور نظری ہم آہنگی کا تعلق ہے، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم سب ایک خدا، ایک رسول اور ایک ضابطۂ قوانین کے ماننے والے ہیں۔ اس سے بڑھ کر فکری اور نظری ہم آہنگی کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی معاملہ ایسا نہیں ہوتا جس پر یہ سب کے سب متفق اور ہم آہنگ ہوں! اس کی وجہ ظاہر ہے۔ چین کے باشندے، فکری ہم آہنگی پر یقین رکھتے ہیں اور اسی بنا پر ایک غیر منقسم وحدت بن گئے ہیں۔ ہمارا دعوئے ہم آہنگی، صرف زبانی اور نمائشی ہے۔ اس لئے ہم اس کی بنا پر ایک اُمت نہیں بن رہے، حالانکہ نظریہ کے اشتراک کی بنا پر تشکیل قوم کا اصول، سب سے پہلے اسلام نے دیا تھا۔ ہم زبان سے فکری ہم آہنگی کا دعوےٰ کرتے ہیں اور عملاً نسل، خون، رنگ، زبان، وطن کی بنیادوں پر الگ الگ قوموں میں بٹے ہوئے ہیں، اور ایک ہی قوم کے اندر، مختلف مذہبی فرقوں کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ سوچئے کہ اگر ہماری یہ ہم آہنگی رسمی نہیں، حقیقی ہو، تو دنیا کی کوئی طاقت، یا طاقتوں کا متحدہ محاذ، ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے؟ یہی وہ احساسِ زیاں تھا جس سے تڑپ کر، اقبالؒ عمر بھر پکارتا رہا کہ

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی + تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے + تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اور قرآن کا یہی وہ پیغام ہے جسے عام کرنا ہم نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے رکھا ہے۔ لیکن، زبانی اقرار اور عملاً انکار کی یہی وہ منافقانہ روش ہے جس کی وجہ سے ہم بھی دوہرے عذاب میں گرفتار ہیں۔ ہم نے اشتراکِ ایمان کو معیارِ قومیت کے دعوےٰ کی بنا پر پاکستان حاصل کیا اور اشتراکِ وطن کے معیارِ قومیت بننے کو خلافِ اسلام قرار دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد، ہمارا زبانی دعوےٰ تو وہی رہا لیکن عملاً ہم نے اشتراکِ وطن کو معیارِ قومیت قرار دے دیا۔ اس ــــ با ما نماز کرد و بہ زاہد شراب خورد ــ کی دورخی پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کسی بنیاد پر بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ حالت ہماری یہ ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر - کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

یاد رکھئے! زمانہ بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس تسابق میں وہی قومیں زندہ رہ سکیں گی جو اپنے نظریات پر ایمان محکم رکھیں گی۔ تذبذب، منافقت اور دورخی کے مسلک کی حامل قومیں، تباہ ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ

ثبات زندگی ایمان ... سے ہے دنیا میں

اگر مسلم اقوام نے اس حقیقت کو نہ سمجھا، اور زبانی دعاوی کو زندگی کا عملی شعار نہ بنایا تو یہ خاکِ رہگذر

بن جائینگی جیسے برتیز خرام قوم روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیگی۔ وَ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵/۱۲)، جس ایمان کا مظاہرہ عمل سے نہیں ہوتا تو یہی نہیں کہ وہ ایمان مردہ ہو جاتا ہے۔ ایسا ایمان قوموں کے حق میں سمِ قاتل بن جاتا ہے، وہ انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ اس سے دینؔ مذہب کی سطح پر آجاتا ہے اور جہاں دین، قوموں کو اوجِ ثریا سے ہمکنار کر دیتا ہے، مذہب انہیں جہنم کی پستیوں میں گرا دیتا ہے۔ دین کے ساتھ رسمی نسبت اور عملاً بیگانگی، مذہب کہلاتی ہے، اور یہ بے یقینی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ دین کیطرف پلٹنے کے لئے، اس کے نظریات پر یقینِ محکم شرطِ اوّل ہے — حیاتِ جاوداں اندر یقین است۔ اسی سے امت کے منتشر ذرے ایک مستحکم چٹان بن جاتے ہیں اور یہی چٹان مخالفتوں کے طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے - یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اور یقین، صحیح تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ہم پھر اسی مقام پر آگئے جہاں کہا گیا تھا کہ، ہماری مصیبتوں کا اس کے سوا کوئی مداوا نہیں کہ قوم میں صحیح ذہنی اور نفسیاتی تبدیلی پیدا کی جائے۔ اسی تبدیلی کا نام ایمان یا یقین ہے۔ قرآن کی رو سے، آزادی محض کسی مملکت کے حاصل ہو جانے کا نام نہیں۔ آزادی، افرادِ مملکت کے اپنے نظریاتِ حیات پر یقینِ محکم سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر افرادِ مملکت کو ایسا یقین حاصل نہیں تو، اپنی آزاد مملکت کے باوجود، انہیں صحیح آزادی حاصل نہیں۔ محکومی ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

ایمان و عمل

یقیں، مثلِ خلیل آتش نشینی + یقیں اللہ مستی، خود گزینی

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار + غلامی سے بتر ہے بے یقینی

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (۴۱/۳۰) یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے اس صداقت کا اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر اپنے دعوے پر جم کر کھڑے ہو گئے، ان پر فرشتے نازل ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔ مت افسردہ اور غمگین ہو۔ ہم تمہارے لئے اس جنت کی خوشخبری لیکر آئے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے رفیق اور حمایتی ہیں اور آخروی زندگی میں بھی ایسے ہی ہوں گے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ۔ اس جنتی معاشرہ میں جس کی ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں، جیسا تم چاہو گے ہو گا، وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ (۴۱/۳۱) جو تم مانگو گے ملے گا۔ یہ ہوتا ہے، عزیزانِ من! نتیجہ یقینِ محکم کا۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اس بات کے دیکھنے اور پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ہمارا ایمان محکم ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے اور اسکا سمجھنا نہایت ضروری۔ تفصیل اس کی طویل ہے اس لئے میں اس مقام پر صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اقوامِ عالم کے لئے ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" وہ لوگ جو ایمان لائے۔ یَآ اَيُّهَا

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا " اے وہ لوگو جو ایمان لاتے ہو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم، مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مسلم قوم کے فرد تو قرار پا سکتے ہیں۔ مومن نہیں بن سکتے۔ مومن بننے کے لئے ہر فرد کو بذاتِ خود ایمان لانا پڑتا ہے۔ یعنی قرآنی صداقتوں پر غور و فکر کے بعد انہیں صحیح تسلیم کرنا۔

اس کا معیار کیا ہے

آپ اس قسم کی آیات پر غور کیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ..... (۴/۱۳۶) اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر۔ اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی ہے۔ یہاں مومنوں کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مومنوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے مسلم قوم کے فرد قرار پاتے ہیں۔ انہیں بھی ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یا مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ (۵/۶۹) وہ لوگ جو مومن کہلاتے ہیں، یا یہودی، صابئین اور نصاریٰ، جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا، انہیں خوف و حزن نہیں ہوگا۔ یہاں بھی، مومن کہلانے والوں کو اسی طرح ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے جس طرح یہود و نصاریٰ وغیرہ کو۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ مومن بننے کیلئے مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانا کافی نہیں۔ ان کے لئے از خود فکر و بصیرت کے بعد قرآنی حقائق کی صداقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم، جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلم قوم کے افراد کہلاتے ہیں، اس طرح ایمان لائے ہیں! اگر اس طرح ایمان نہیں لائے تو ہمارے ایمان کا ایمان ہونا تو ایک طرف، ہم ایمان لانے والوں کے زمرے میں شمار ہی نہیں ہو سکتے۔

اب آگے بڑھئے۔ ایک شخص، غور و تدبر کے بعد قرآنی حقائق کو صحیح تسلیم کرتا اور اور اس طرح اس پر ایمان لے آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف اس طرح ایمان لانے سے وہ ان خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا مستحق قرار پا جائے گا جنہیں قرآن نے ایمان کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ایمان کیساتھ اس کے مطابق اعمال کا ہونا ضروری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کو شرط قرار دیا ہے دوسری طرف اس نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اعمال کے بغیر ایمان، قطعاً نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُھَا لَمْ تَکُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ۔ اس شخص کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دے گا جو پہلے ایمان نہیں لایا تھا۔ اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِھَا خَیْرًا۔ (۶/۱۵۸) نہ ہی اس شخص کا ایمان نفع بخش ہوگا جس نے اپنے ایمان کے ساتھ اچھے کام نہیں کئے تھے۔ اسی سورہ میں فرمایا ہے۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَ ھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (۶/۸۲) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم

کے ساتھ ملوث دبوتے دیا، تو یہ لوگ ہیں جنہیں امن نصیب ہوگا اور انہی کے متعلق کہا جائیگا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ محض فکری طور پر قرآنی حقائق کی صداقتوں کو صحیح تسلیم کرلینا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآنی پروگرام کے مطابق عمل کیا جائے اور ظلم کی خلاف قرآنی روش نہ اختیار کی جائے۔

اس کے بعد تیسرا سوال سامنے آتا ہے کہ اس کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ہمارا ایمان، ایمانِ محکم ہے اور ہمارے اعمال، قرآنی معیار کے مطابق اعمالِ صالح۔ سو قرآن نے اس کا بڑا آسان اور محسوس معیار بتایا ہے جب کہا کہ

(۱) حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۱۰/۱۰۳) مومنین کو تمام مصیبتوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھنا خدا کے ذمے واجب ہے۔ صرف محفوظ رکھنا ہی نہیں۔

(۲) وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۳۰/۴۷) مومنین کو فتح و نصرت عطا کرنا ہم پر واجب ہے۔

(۳) اس نصرت خداوندی کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۔ (۴/۱۴۱) کفار یعنی غیر مسلم اقوام، کبھی مومنین، پر غالب نہ آ سکیں گے۔ اور

(۴) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)۔ مومن نہ کبھی غم زدہ ہوں گے نہ افسردہ خاطر۔ وہ تمام اقوامِ عالم پر غالب رہیں گے۔

یہ ہے عزیزانِ من! یہ پرکھنے کا معیار کہ ہم، مسلمان کہلانے والی اقوام کا، قرآنی صداقتوں پر ایمان ہے یا نہیں اور ہمارے اعمال، اس کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؛ یہ ایسا ابھرا اور نکھرا ہوا معیار ہے جس میں نہ کسی قسم کا دھوکا لگ سکتا ہے، نہ ابہام و التباس ہو سکتا، حقیقت یہ ہے کہ ہم مذہب کے فریب میں آئے ہوئے ہیں اور دین کے ثمرات کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور جب وہ ہمیں حاصل نہیں ہوتے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے واشگاف الفاظ میں کہ دینا چاہیئے، خواہ وہ حقیقت ہم پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے کہ ہم مسلمانانِ عالم کو یکسو ہو کر سوچنا اور فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اسی طرح مذہب پرست، رواجی مسلمان رہنا چاہتے ہیں یا قرآنی معیار کے مطابق ایمان و اعمال سے دین کا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اسی طرح کے مسلمان رہنا چاہتے ہیں، تو حریم کعبہ اور جبلِ رحمت تک میں ہزار مقدس دعاؤں اور لاکھ معصوم تمناؤں کے باوجود ہم ذلت و نکبت کی موجودہ زندگی سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم اسی طرح ناکامیوں کی زندگی جئیں گے اور نامرادیوں کی موت مر جائیں گے۔ اور ہماری آنے والی نسلیں، یہ سمجھ کر کہ ہماری ان ذلتوں اور ناکامیوں کا باعث مذہب تھا، اسلام ہی سے منحرف ہو جائیں گی۔ دنیا میں ہر مذہب پرست قوم کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہم اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے۔ اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ان خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوں جنہیں اسلامی زندگی کا

فطری نتیجہ بتایا گیا ہے، تو ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم موجودہ مذہب اور خدا کے عطا کردہ دین میں فرق کریں۔ قرآنی صداقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لائیں اور اس کے مطابق عملی نظام متشکل کریں۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف میں قوم کو دعوت دیئے چلا آرہا ہوں اور جس کی وجہ سے میں مذہب پرست طبقے کی طرف سے مطعون و مردود قرار دیا جا رہا ہوں۔ لیکن جس حقیقت کو میری نگاہِ بصیرت نے بے نقاب دیکھ لیا ہے میں ان کی مخالفت کی وجہ ... اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟ اور یہی ہے برادرانِ عزیز! تحریک طلوعِ اسلام کا مقصد و منتہیٰ۔

کسقدر خوش بخت ہیں وہ سعادت مند، جو ایسے بلند مقصد کے حصول کے لئے اس تحریک کا ساتھ دیتے ہیں اور یہی ہیں وہ خوش نصیب افراد جن سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ پر چھائی ہوئی مایوسی کی گھٹائیں کتنی ہی ہولناک کیوں نہ ہوں، آپ کے لئے، ان میں لرزاں و ترساں تو ایک طرف افسردہ خاطر ہونے کی بھی کوئی بات نہیں۔

سحر کے اجالوں کا پیغام ہیں یہ ۔ اندھیروں سے کیوں، میر گھبرا رہے ہو

لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو اسکا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ جب فضائے عالم پر مایوسیوں کی اس قدر دبیز گھٹائیں چھا گئی ہیں، تو آپ احباب کی، جو امیدوں کی قرآنی قندیل کے علمبردار ہیں، ذمہ داریاں کسقدر بڑھ گئی ہیں۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ صدیوں کی ہولناک خاموشی کے بعد قرآن خالص کی آواز، ہمارے زمانے میں بلند ہوئی ہے اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اس نشید حیات افروز کے نقیب آپ ہیں۔ اسوقت اقوامِ عالم کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس + مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیار

ان قید خانوں کے تالوں کو صرف قرآنی کلید کھول سکتی ہے، اور وہ کلید آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے آپ سوچ لیجئے کہ آپ پر کسقدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری تحریک ان احباب ہمت پر مشتمل ہے جن کے وسائل نہایت محدود ہیں۔ ہمیں کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد حاصل نہیں، نہ ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ قرآنی انقلاب، ہر نوع کے مفاد پرستوں اور طالع آزماؤں کے لئے پیامِ مرگ ہے۔ اس لئے اس تحریک کی امداد کون کریگا؟ مجھے اسکا بھی احساس ہے کہ آپ احباب اس میں پہلے ہی اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ ہمت سے کام لیں اور قرآنی پیغام کے عام کرنے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

ہمت بلند

عزم سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ ۔ منزل ہے آسمان تو بے بال و پر نہ جا

آپ ہمت کیجئے اور پھر دیکھئے کہ توفیق ایزدی آپ کے مخلص ہاتھوں کے بکھیرے ہوئے ان صالح بیجوں سے ایک ملک کے بدلے میں کسطرح سات سات سو دانے پیدا کرتی ہے، اکہ یہ اُس خدا کا وعدہ ہے جو اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (۴/۱۲۲)

(۰)

اور آخر میں ایک نوید نشاط آور۔ میں ہر کنونشن میں بالعموم آپ احباب کی خدمت میں کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کیا کرتا ہوں۔ اس سال میں ایک ایسا تحفہ پیش کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں جو میرے اس اخیر عمر کا عزیز ترین سرمایہ اور گراں بہا متاع ہے۔ میں نے خدا، کائنات اور انسان کا صحیح صحیح مقام خدا کی کتاب عظیم سے پہچانا۔ یہ اس صحیفۂ ربانی کا مجھ پر گراں بار احسان تھا جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میں نے عمر بھر اپنی بساط کے مطابق کوشش کی۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا حساب وہ خالق کائنات لگا سکتا ہے جس کے ترازو میں نیتوں تک کا وزن ہو جاتا ہے۔

پھر میں نے شرف انسانیت کے معراج کبریٰ کو حضور ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت طیبہ سے پہچانا اور آپ کے اس احسان عظیم سے میری گردن بارگاہ رسالت میں ہمیشہ جھکی رہی۔ اس کے لئے میں نے اس بارگاہ کبریا جاہ میں اپنی عقیدت کا حقیر سا نذرانہ، معراج انسانیت کی شکل میں پیش کیا، اس توقع کے ساتھ کہ اس ذات اقدس و اعظم کی رحمۃ للعالمینی سے شرف قبولیت عطا فرمائے۔

اور میں نے دین کو ایک مکمل نظام حیات کی شکل میں، حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں دیکھا اور اس سے میرے سامنے زندگی کی بڑی حسین اور تابناک راہیں کشادہ ہو گئیں۔ جناب فاروق اعظمؓ کا یہ مجھ پر بہت بڑا قرض تھا جس سے سبکدوش ہونے کے لئے میں گذشتہ بیس پچیس سال سے کوشش کر رہا تھا۔ اللہ الحمد کہ میں اپنی طرف سے، اس کوشش میں کامیاب ہو گیا، اور عہد فاروقی کا ایک ایسا بہار آفریں مرقع مرتب ہو گیا جس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائیگی کہ اسلامی نظام حیات سے کیا مراد ہے، اور وہ کسطرح محسوس پیکروں میں دنیا کے سامنے آیا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ وہ نظام آگے کیوں نہ چلا اور کسطرح رفتہ رفتہ ہمارے مروجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا۔

یہ ہے میری وہ پیشکش جسے میں اس کنونشن میں آپ احباب کے نذرانہ کیلئے لیکر حاضر ہو رہا ہوں۔

روایت ہے کہ حضورؐ نبی اکرم نے دعا مانگی تھی کہ ابوجہل اور عمر میں سے کوئی ایک، اسلام قبول کرکے، دین کی تقویت کا موجب بنے۔ اس سے واضح ہے کہ حضورؐ کی نگہ بصیرت نے انکی مضمر صلاحیتوں کو کسطرح بھانپ لیا۔ یہ دعا عمر ابن الخطاب کے حق میں قبول ہوئی۔

نبی اکرمؐ معلم، مربی، اور مزکی تھے۔ یعنی مناسب تعلیم و تربیت سے اپنے رفقا کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا فریضۂ رسالت تھا۔ حضورؐ کی تربیت سے حضرت عمرؓ کی مضمر صلاحیتوں کو ایسی جلا ملی کہ آپ نابغۂ روزگار بن گئے۔ چونکہ حضرت عمرؓ کا اسقدر عدیم المثال کمالات کا پیکر بن جانا، حضور رسالتمآبؐ کی انسانیت ساز صورت گری کا رہین منت تھا، اس لئے میری چشم بصیرت نے فاروق اعظمؓ کو شاہکار رسالت کہہ کر پکارا ہے، اور یہی میری اسی کتاب کا نام ہے حضور نبی اکرمؐ، شاہکار خالق فطرت ــــ اور عمر فاروقؓ، شاہکار رسالت۔

میں اپنے اس نذرانۂ عقیدت کو ملت اسلامیہ کے حضور یہ کہکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من۔
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند۔

والسلام

محمد اسلام
طلوع اسلام کنونشن میں اظہار

یہ بھی شریعت وہ بھی شریعت

(اسلام کیخلاف ایک خطرناک سازش)

صدرِ محترم و سامعین گرامی قدر!

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ۔ چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی ۔

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں شرار بولہبی نے چراغِ مصطفویؐ کو بجھانے کیلئے فکری سطح پر جو کوششیں اور سازشیں کیں ان کی تفصیل طول طویل ہے، لیکن اسکے لئے اُس نے جو طریق کار اختیار کیا اسمیں تین شقیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ پہلا طریق مخاصمانہ تھا یعنی مختلف مذاہب عالم یا نظامہائے حیات نے یہ دعوے کیا کہ وہ اسلام سے افضل اور اعلےٰ ہیں۔ لیکن تجربہ نے بتایا کہ یہ طریق کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسکے بعد وہ طریق کار اختیار کیا گیا جسے بنگال کے راجہ رام موہن رائے نے وضع کیا اور جو برہمو سماج کے نام سے متعارف ہوا۔ انکی اسکیم یہ تھی کہ مختلف مذاہب کی اچھی اچھی باتیں یکجا کر کے ایک نیا مذہب وضع کر لیا جائے۔ سطحی طور پر یہ اسکیم بڑی خوش آئند تھی لیکن عملاً یہ بھی ناکام ثابت ہوئی کیونکہ لوگ اپنا سابقہ مذہب چھوڑنے کیلئے جلدی سے آمادہ نہیں ہوتے۔ برہمو سماجی اسکیم کے اس سقم کو دُور کرنے کیلئے

برہمو سماج اسلام

مولانا ابوالکلام آزادؒ (مرحوم) آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا کہ کسی کو اپنا مذہب چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اصلی چیز خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی ہے۔ اس پر ہر مذہب میں رہتے ہوئے عمل کیا جا سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور کانگریس نے اس اسکیم کو بہت اچھالا کیونکہ اس سے یہ خطرہ ٹل گیا کہ اگر اسلام ہندو دھرم کے بالمقابل آیا تو اسلام کی افضلیت ثابت ہو جائے گی۔

یورپ میں اس سے پہلے ایک تحریک چل رہی تھی جسکی رو سے کہا جاتا تھا کہ اصل شے نیک عملی، یعنی ایسے کام کرنا ہے جو نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوں۔ اسکے لئے مذہب کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں نے مولانا آزادؒ کے اس دعویٰ سے دلیل حاصل کی اور کہا کہ انکی اسکیم میں "خدا پرستی" کا اضافہ محض جذباتی تسکین کے لئے ہے۔ اصل شے اچھے اخلاق ہیں، اور اچھے اخلاق عالمگیر ہیں۔ یہیں سے اس نظریہ نے تقویت پکڑی کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیئے کیونکہ عملی زندگی میں اصلی چیز مفید مطلب فیصلے ہیں نہ کہ خاص اعتقادات۔ ہماری نئی نسل میں یہ نظریہ آجکل عام ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں

سیکولرازم

کہ جن اخلاق کو آپ اسلام کی خصوصیات کہتے ہیں انہیں سیکولر حکومتوں میں بھی اچھے اخلاق تسلیم کیا جاتا ہے، پھر آپ اسلام کی رٹ کیوں لگاتے ہیں۔ انکے اس اعتراض کا جواب وہ ہے جو قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ سیکولر انداز اگر آج کسی بات کو اچھا کہتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ اپنی مصلحت کے تابع کل ہی اسے برا قرار دیکر چھوڑ دے۔ لیکن اسلام میں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں اچھے اور برے میں مستقل طور پر تفریق کر دی گئی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسمیں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتی۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ (۶/۱۱۵) "قوانین خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا"

یہ اسلام کا ابدی اصول ہے اور یہ بنیادی فرق ہے سیکولر اور اسلامی نظریۂ زندگی میں۔ سیکولر نظام کی رو سے دنیا کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی کہ جو کچھ آج صحیح تسلیم کیا جاتا ہے یہ نظام مستقلاً اس پر قائم رہیگا۔ اسکے برعکس قرآنی نظام کی رو سے اقوام عالم کو پورا پورا اطمینان حاصل ہوگا کہ جسے یہ لوگ صحیح سمجھتے ہیں اس پر ہمیشہ کاربند رہیں گے، جسے غلط کہتے ہیں اسے کبھی اختیار نہیں کریں گے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ امریکہ میں پریذیڈنٹ کے انتخاب کا وقت آتا ہے تو ساری دنیا کی حکومتیں گوش برآواز ہو جاتی ہیں اور مستقبل کے متعلق اپنی ہر پالیسی کو التوا میں رکھ دیتی ہیں اس لئے کہ کسی کو یقین نہیں ہوتا کہ نیا صدر کس قسم کی پالیسی اختیار کریگا۔ یہی کیفیت دیگر بڑی بڑی طاقتوں کی بھی ہے۔ وہاں بھی پارٹیوں کے بدل جانے سے دنیا کی لبساط سیاست کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے سیکولر نظام سیاست کا۔ اسکے برعکس قرآنی نظام ہے کہ اسمیں کسی کو کسی قسم کا دھڑکا نہیں ہوتا۔ اسکے اصول غیر متبدل اور اس کی اقدار ناقابل تغیر ہیں۔ افراد آئیں اور چلے جائیں، حکومتیں بنیں اور بدلیں، اس سے ان اصول و اقدار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آپ سوچیئے کہ اس سے عالم انسانیت کو کسقدر امن کی ضمانت مل جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ان اصولوں پر کاربند رہنے والوں کو جو مومن کہکر پکارا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ مومن سے مراد ہے امن عالم کی ضمانت دینے والا۔ یہ ہے اسلامی نظام کی وہ منفرد خصوصیت جسکا مقابلہ کوئی نظام نہیں کر سکتا، اور یہ ہے وہ دلیل جو ہم ایمان بالضرورت اور اسلام کی فوقیت کے لئے پیش کرتے ہیں۔ یہ دلیل خود قرآن کی پیش کردہ ہے۔

اسلام کی اس دلیل محکم اور منفرد خصوصیت کو ختم کرنے کے لئے ایک نئی تحریک وجود میں لائی گئی جس کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اسلام میں کوئی چیز غیر متبدل نہیں۔ آج جو بات صحیح ہے وہ کل کو غلط قرار پا سکتی ہے۔

مودودی صاحب کا اسلام

چنانچہ انہوں نے پاکستان میں آکر اس نظریہ کو عام کیا اور اسطرح اسلام اور سیکولر نظام کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ مولانا آزاد نے اپنے نظریہ کی نشر و اشاعت کیلئے نہ کوئی جماعت بنائی تھی اور نہ ہی کوئی تحریک چلائی۔ اسلئے ان کا نظریہ ان کی ذات کیساتھ ختم ہو گیا، لیکن مودودی صاحب نے اسکے لئے ایک جماعت کی بھی تشکیل کی ہے اور ایک تحریک بھی چلائی ہے جس کی پشت پر دولت کا انبار ہے۔ ہمارے نزدیک اسوقت اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہی تحریک ہے اور اسی وجہ سے طلوع اسلام کیطرف سے اسکی مسلسل مخالفت کی جاتی ہے۔ یہ مخالفت نہ مودودی صاحب کی ذات کی مخالفت ہے نہ انکے کسی فیصلہ کی مخالفت ہے۔ یہ مخالفت اسلئے ہے

کہ ہمارے نزدیک مودودی صاحب کی تحریک اُسی سازش کی ایک کڑی ہے جو اسلام کی حقانیت کو ختم کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی۔ پرویز صاحب نے جب ۱۹۳۱ء میں مولانا آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" پر تنقید کی تھی تو اسلئے نہیں کہ انہیں اس تفسیر کے کسی خاص مقام سے اختلاف تھا۔ یہ اسلئے تھا کہ انکے نزدیک مولانا آزاد کی تحریک اُسی سازش کی ایک کڑی تھی جسکا آغاز ہندوستان کی "بھگتی تحریک" سے ہوا اور اسے راجہ رام موہن رائے نے آگے بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب نے مولانا آزاد کے پیش کردہ تصورِ اسلام کو برہمو سماجی اسلام کہکر پکارا تھا۔ ہمارا جو جذبۂ محرکہ مولانا آزاد کے پیش کردہ "برہمو سماجی اسلام" کی مخالفت

ہماری مخالفت

کے لئے تھا وہی جذبہ مودودی صاحب کے مسخ کردہ اسلام کی مخالفت میں کارفرما ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ کوئی فروعی سوال نہیں۔ یہ نہایت اہم اصولی سوال ہے، اسلئے ہم اس کی مخالفت اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ میں نے مودودی صاحب کے لٹریچر کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے جس سے میرے سامنے ایسے مسائل کا ڈھیر لگ گیا ہے جنہیں مودودی صاحب نے، آج ایک بات کو عین مطابق اسلام قرار دیا ہے اور دوسرے وقت اسے اسلام کے خلاف قرار دیکر اس سے متضاد راستے کو اسلامی بتایا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ان تضادات کو ایک مستقل تصنیف کی شکل میں شائع کروں تاکہ قوم کو معلوم ہو جائے کہ یہ تحریک، جسے اقامتِ دین کی تحریک کہا جاتا ہے، درحقیقت دین کو اس کی اصل و بنیاد سے اکھیڑنے کی کسقدر گہری نقاب پوش سازش ہے۔ آج کی نشست میں، میں ان میں سے چند ایک مسائل آپ احباب کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں جو اقتباسات پیش کرونگا انہیں حوالوں کے صحیح ہونے کی پوری پوری ذمہ داری کیساتھ پیش کروں گا۔ اگر کوئی شخص انہیں چیلنج کرے تو آپ مجھے اطلاع دیں۔ اس تمہید کے بعد، آپ ان تضادات کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب جماعتِ اسلامی اِدھر آگئی تو ایک تو وہ کمزور سی جماعت تھی، اور دوسرے وہ تحریکِ پاکستان کے دوران مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے عوام کی نگاہوں میں مطعون تھی جب ۱۹۵۰ء میں یہاں انتخابات کا زمانہ آیا تو مودودی صاحب نے فیصلہ کیا کہ انکی جماعت انتخابات میں حصّہ نہیں لے گی۔ اس فیصلہ کی تائید میں انہوں نے کہا:

انتخابات

اب ہم کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دیگی نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں، بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور

جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔ (بحوالہ جماعت اسلامی کی انتخابی "جدوجہد" مطبوعہ ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۱ء)

مودودی صاحب کے نزدیک یہ فیصلہ کسقدر اسلام کی اساسات میں سے تھا اسکا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر اسلام کی یہی تعلیم ہے تو پھر اسکا کیا جواب ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کی امیدوار کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ اسکے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اسکے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کیساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک اسلام کا یہ اصول اسقدر محکم تھا کہ اس کے خلاف حضرت علیؓ کے فیصلہ کو بھی انکی لغزش قرار دیا گیا۔

چند سال بعد ۱۹۵۸ء کے انتخابات کے زمانہ میں، جماعت اسلامی کی پوزیشن قدرے بہتر ہو گئی اسلئے اس سلسلے میں مودودی صاحب نے اپنے سابقہ فیصلہ میں حسب ذیل ترمیم فرمائی:

جماعت اسلامی نے ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اسلئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر شکست کیلئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں ..... اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا ہے کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۲۳)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کی پہلی پالیسی بھی، انکے بیان کے مطابق، عین مطابق اسلام تھی، اور اب یہ تبدیل شدہ پالیسی بھی عین مطابق اسلام، یہ الگ بات تھی کہ یہ چیز جماعت اسلامی کے بہت سے اکابرین

کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے کہ اس قسم کی اصول شکنی تو کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ اس کا مودودی صاحب نے کیا جواب دیا تھا اسے ہم آخر میں بیان کرینگے۔ اسکے بعد جب ۱۹۶۲ء کے انتخابات کا وقت آیا تو جماعت اسلامی نے اسمیں بھرپور حصہ لیا۔ خود اپنے امیدوار کھڑے کئے اور وہ سب کچھ کیا جو انتخابات میں کیا جاتا ہے اور اسے بھی عین مطابق اسلام قرار دیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس جماعت نے جس طرح حصہ لیا وہ سب کے سامنے ہے۔

آپ غور کیجئے کہ اس اسلام میں [illegible] جو مصلحتوں کے ماتحت اسطرح بدلتا جائے اور سیکولر نظام میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم کی رُو سے ہر وہ نظام اور اقدام جو امت میں الگ الگ گروہ بندی کا موجب بنے

پارٹی سسٹم

سخت ممنوع ہے۔ قرآن نے اسے شرک قرار دیا ہے۔ مودودی صاحب نے انتخابات میں حصہ لینے کے بعد پارلیمان میں پارٹی سسٹم کے متعلق کہا تھا:

> مجالس قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہئے۔ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بہتر سے بہتر نمائندے منتخب کرانے کے لئے انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں مگر منتخب ہو جانے کے بعد ارکان مجلس قانون ساز کو پارٹیوں کی وفاداری سے آزاد ہو کر اپنے ضمیر و ایمان کے مطابق اپنے فیصلے انجام دینے چاہئیں۔ (دستور تجاویز ابوالاعلیٰ مودودی۔ صلا)

یہ پہلے اسلام کی بات ہے۔ اسکے بعد جب جماعت اسلامی کے منتخب اراکین کی تعداد میں قدرے اضافہ ہو گیا تو پھر اس اسلام میں ترمیم کر دی گئی۔ چنانچہ اخبارات میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ

> لاہور۔ ۹ اگست (سٹاف رپورٹر) جماعت اسلامی نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی پارلیمانی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کیجائے۔ (کوہستان۔ ۱۰ اگست ۱۹۶۲ء)

—————(٭)—————

مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کے دوران جمہوری نظام کو کافرانہ نظام کہا تھا۔ اب یہ جماعت اسی

ویٹو کا استعمال

نظام میں برابر کی شریک ہو گئی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ نظام صدارتی ہو یا پارلیمانی۔ پارلیمانی نظام میں فیصلے اکثریت سے ہوتے ہیں۔ صدارتی نظام میں پریذیڈنٹ کو ویٹو کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ویٹو کے متعلق مودودی صاحب کے پہلے اسلام کا فیصلہ حسب ذیل تھا:

> جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اسکو سیاہ و سفید کے اختیارات ہونگے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہونگے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اسلئے چھوڑ دیا جائے کہ اسکی تائید میں ایک جم غفیر نہیں

ہے۔ لہذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (پمفلٹ۔ اسلام کا نظریہ سیاسی صفحہ ۴۹)

دوسرے مقام پر کہا :

امیرِ مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو کا استعمال کر سکے گا۔ (ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۳)

ایک اور جگہ اسے ان الفاظ میں دھرایا۔

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔ (دو دستوری خاکے صفحہ ۲۸)

اسکے بعد، صدر ایوب کے زمانہ میں نظام حکومت صدارتی قرار پایا تو مودودی صاحب نے اسکے خلاف حسب ذیل فتویٰ صادر فرما دیا۔

جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے لیا جائے یا جسے انکی جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ" ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ دے دینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

(ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

اسکی مزید وضاحت انہوں نے اسطرح فرمائی :

کچھ عرصے سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لئے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حق تنسیخ ملنا چاہیئے کیوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا اور منکرین زکوٰۃ و مدعیان نبوت کی سرکوبی کیلئے جہاد کا حکم دے کر صحابہؓ کی رائے کو رد کر دیا۔ گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جا رہا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۶۳ء)

آپ نے دیکھا کہ ایک وقت میں صدر یا امیر کے لئے ویٹو کا حق عین مطابق اسلام تھا اور دوسرے وقت وہی یکسر اسلام کے خلاف قرار دیدیا گیا اور اسے دھاندلی پر مبنی قانون ٹھہرایا گیا۔ فرمائیے کہ اس اسلام میں اور سیکولر نظام میں کیا فرق ہے ؟

اب آگے چلیئے۔ صدر ایوب کے زمانہ میں ایک اہم سوال سامنے آیا۔ صدارتی انتخاب کیلئے ان کے مقابلہ میں محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کھڑی ہوئیں۔ اس سوال کے متعلق کہ اسلام کی رو سے عورت امورِ مملکت میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں۔ مودودی صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ

مجلس دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔ اسلام کے اصول اسکی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظام ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ (دستوری تجاویز)

ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں تحریر فرمایا:

کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ گھر میں تو عورت کو قوام نہ بنائے گا لیکن کئی لاکھ گھروں کے مجموعہ (یعنی مملکت) پر اس کو قوام بنا دے گا۔

آپ نے دیکھا مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ عورت امور مملکت تو ایک طرف خود اپنے گھر میں بھی کسی اختیارات کی مالک نہیں قرار دی جا سکتی۔ انہوں نے کہا یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جو علیم و خبیر ہے۔ لیکن جب مس فاطمہ جناح (مرحومہ) صدارت کے لئے کھڑی ہوئیں تو اسلامی جماعت نے انکی تائید کرنے کا فیصلہ کیا اور

اپوزیشن کی صدارتی امیدوار محترمہ فاطمہ جناح پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی صاحب نے چیلنج کیا کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع عورت کا سربراہ مملکت ہونا قطعی حرام ہے اور اس سلسلہ میں استثناء کی قطعی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔ (روزنامہ مشرق ۱۲-۱۰-۶۴)

فرمایئے آپ اس قسم کے اسلام کے متعلق کیا کہیں گے؟

غیر مسلموں کی پوزیشن

اب آگے بڑھیئے مودودی صاحب کا دعویٰ ہے کہ دو قومی نظریہ کا تصور پہلے پہل انہوں نے پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کوئی غیر مسلم، مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا اور جب وہ اس قوم کا فرد ہی قرار نہیں پا سکتا تو وہ انکی حکومت میں کس طرح شریک کار ہو سکتا ہے؟ اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا ہے۔ ذمیوں کے متعلق مودودی صاحب کا پہلے ارشاد یہ تھا کہ

مجلس قانون ساز میں غیر مسلموں (اہل ذمہ) کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملیگا۔
(اسلامی ریاست صفحہ ۵۲۵، ۱۹۶۷ء ایڈیشن)

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ پاکستان میں جب مودودی صاحب نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ ووٹرز میں (بالخصوص مشرقی پاکستان میں) غیر مسلموں کی بھی خاصی تعداد ہے اور انکی حمایت حاصل کرنا نہایت ضروری۔ چنانچہ انہوں نے جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے سلسلہ میں اپنا منشور شائع کیا تو پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کے متعلق کہا کہ انہیں نہ صرف حق رائے دہندگی حاصل ہوگا بلکہ وہ مجالس آئین و قوانین ساز کے رکن بھی بن سکیں گے۔ اس سلسلہ میں ایک پریس کانفرنس میں جب مودودی صاحب سے کہا گیا کہ انکا ارشاد تو یہ تھا کہ اسلام کی رو سے اہل ذمہ، مجالس آئین و قوانین ساز کے لئے نہ رائے دے سکیں گے نہ انہیں رکنیت کا حق حاصل ہوگا۔ اب آپ نے اپنے اس فیصلہ میں کیسے تبدیلی کر دی، تو مودودی صاحب نے فرمایا:

> یہ دراصل ایسے ذمی نہیں ہیں جیسے ابتدائے اسلام میں ہوا کرتے تھے۔ یعنی وہ غیر مسلم جو جنگ سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کی حکمرانی قبول کرتے تھے۔ یہ لوگ ایک سیاسی نظام کے تحت ذمی ہوتے ہیں۔ اسلئے اگر وہ قومی اسمبلی میں آتے ہیں تو ہمیں یہ صورت حال قبول کرنی پڑے گی۔ (طلوع اسلام - فروری ۱۹۷۰ء)

ان سے کوئی پوچھے کہ چند ہی سال اُدھر جب انہوں نے ذمیوں کے متعلق کہا تھا کہ وہ ان مجالس کے رکن نہیں بن سکتے تو اُسوقت کے ذمیوں میں اور اس وقت کے ذمیوں میں اور اس وقت کے ذمیوں میں فرق کیا تھا؟ پھر اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اب ان غیر مسلموں کو حق رائے دھندگی وغیرہ دیدیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی ہندو امیدوار کھڑا ہو گا تو میں : اپنا ووٹ اسے دوں گا کیونکہ اس نے اکثریت کی حکومت کے نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ مصلحتوں کے مطابق کسطرح اسلام بدلتا جاتا ہے۔

پیشہ وکالت ایک مثال اور تقسیم ہند سے قبل مودودی صاحب نے پیشۂ وکالت کے متعلق ایک وکیل کے استفسار پر حسب ذیل ارشاد فرمایا تھا۔

> اپنے پیشے کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے سو فیصدی صحیح ہے اور آپکی سلامت طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابق شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچ کر کم حرام اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے اور بغاوت سے بچکر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف کھُلی بغاوت ہے۔ اسکے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم، اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔
>
> (ترجمان القرآن - جنوری فروری ۱۹۴۴ء صفحہ ۸۳ تا ۸۶)

پاکستان میں جب جماعت اسلامی نے حصول اقتدار کیلئے کوشش شروع کیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ اسکے لئے وکلاء حضرات بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں چنانچہ اُس وقت کے امیر جماعت میاں طفیل محمد نے ۸ / مارچ ۱۹۶۸ء کو ساہیوال بار کونسل میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> آپکا تعلق ایک ایسے طبقے سے ہے جو ملک و قوم میں اپنی خدمات کے لحاظ سے ایک اُونچا مقام رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی لیڈرشپ ہمیشہ ماہرین قانون کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ

امام محمدؒ، امام یوسفؒ (رحمۃ اللہ تعالےٰ اجمعین) سب ماہر قانون ہی تو تھے اور مسلم معاشرے کے نباض کی حیثیت سے انکی راہ نمائی پر کامل اعتماد کیا جاتا تھا۔ آج آپ بھی اُسی مسند پر بیٹھے ہوئے قوم کو اپنی طرف بُلا رہے ہیں۔ آپکے کاندھوں پر ایک زبردست ذمہ داری کا بوجھ ہے جسے انتھک لگن اور مسلسل کاوش سے ہی آپ اٹھا سکتے ہیں۔

یہ تقریر تو میاں طفیل محمد صاحب کی ہے لیکن ایک تو انکی یہ تقریر بحیثیت امیر جماعت اسلامی ہے اور دوسرے مودودی صاحب نے اسکی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔ اب آپ غور فرمایئے کہ وہی حضرات جن کے پیشے کو اس سے پہلے خدا کے خلاف بغاوت اور جن کی کمائی کو حرام کی کمائی قرار دیا جاتا تھا اب انہیں کس طرح امام ابو حنیفہؒ امام محمدؒ اور امام یوسفؒ جیسی ہستیوں کا ہم مسلک قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی عین مطابق اسلام تھا اور یہ بھی عین مطابق اِسلام ہے۔

اور یہیں سے ایک اور مثال ہمارے سامنے آتی ہے۔

۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا ایک نہایت اہم اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اُسکی روئداد کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

قول اور عمل کا تضاد

۱۹۵۶ء کی معرکۃ الآرا شوریٰ جماعت اسلامی جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ زیر بحث آئی اس رپورٹ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لگایا گیا تھا کہ مولانا مودودی نے تحریکِ اسلامی کے محرکِ اوّل اور جماعت اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں قتل گاہیں ہیں اسلئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے۔

چنانچہ مولانا کی اس زوردار تنقید سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی کے متعدد کارکنوں اور ارکان نے اپنی اولاد کو مروّجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں سے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکو" بنا دیں اور انکے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیر جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا۔ یہی اقدام ناقابلِ تصور تھا مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سنا کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرا دیا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔ ہفتہ وار المنبر۔ لائل پور ۷۔۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اسکا خلاصہ یہ تھا کہ:

> میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا۔ اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں، میں بعض لوگوں کے تصور کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر "ظالم باپ" ضرور بنتا۔ اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اسکی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی۔ (ایضاً)

یہ روئداد لائل پور کے ہفتہ وار اخبار المنبر کی ۷ اور ۱۴ - اکتوبر ۱۹۶۶ء کی مشترکہ اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اخبار مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے جو مودودی صاحب کی اس قسم کی حرکتوں سے دل برداشتہ ہو کر جماعت سے الگ ہو گئے ہیں۔ ان سے ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ مجلسِ شوریٰ میں مودودی صاحب کے اس جواب پر اراکینِ مجلس کا ردِ عمل کیا تھا۔ وہ مودودی صاحب کے اس جواب کے خلاف اٹھ کیوں نہ کھڑے ہوئے۔ اسکے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ حضرات مودودی صاحب کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔ اسوقت اراکینِ جماعت کی کل تعداد تیرہ سو تھی، اور ان میں ایک سو بیس ارکان مودودی صاحب کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ یعنی ہر گیارھواں رکن جماعت سے تنخواہ پاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، اس قسم کی مثالیں بیشمار دی جا سکتی ہیں لیکن اس کے لئے قلتِ وقت مانع ہے۔ اس کے بعد، میں اس سوال کیطرف آنا چاہتا ہوں جس نے ہمارے زمانے میں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی یہ سوال کہ زمین پر ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں اور حکومت کو صنعتوں وغیرہ کو قومی تحویل میں لینے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں۔ مودودی صاحب کی مشہور کتاب ہے "مسئلہ ملکیتِ زمین" اس میں انہوں نے ملکیت زمین کے متعلق لکھا تھا:

ذاتی ملکیت

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی معاملے میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد (زمین) ہی میں کونسی خصوصیت ہے جسکی بنا پر صرف اسکے معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اسکے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔۔۔۔ اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی نہیں عائد کر سکتے۔۔۔۔ جسطرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز

اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو ۔ ۔ ۔ پھر جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔

(لہذا) سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔

(مسئلہ ملکیت زمین سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

جہاں تک صنعتوں کے قومیانے کا تعلق ہے انہوں نے اسی کتاب میں لکھا تھا:

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے لہذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جنکی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا ہو بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جنکے ذریعے سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے بلکہ در حقیقت اسلامی نظریۂ تمدن واجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے۔ تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔"

یہ اس زمانہ کا اسلام تھا جب یہاں اقتدار زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے سلسلہ میں پیپلز پارٹی نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور صنعتی ادارے اور دیگر اسی قسم کی تنصیبات بھی قوم کی تحویل میں چلی جانی چاہئیں۔ اس نعرہ میں اتنی بڑی کشش تھی کہ یہ لوگ جوق در جوق اس پارٹی کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ جب مودودی صاحب نے دیکھا کہ اسطرح انتخابات میں ان کی جماعت کو شکست ہو جائے گی تو انہوں نے رنگ بدلا اور اپنے "انتخابی منشور" میں لکھا کہ

قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو (۱۰۰) اور دو سو (۲۰۰) ایکڑ کے درمیان ہوگی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اسی معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں سو (۱۰۰) بیگھہ کی حد رکھی جائے گی۔ اس

سے زائد ملکیتوں کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے گا۔

صنعتوں کے قومیانے کے متعلق کہا:

ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے انہیں قومی ملکیت میں بعاوضہ لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے۔

آپ نے غور فرمایا کہ معاشی نظام جیسے اہم اور بنیادی مسئلہ کے متعلق مودودی صاحب نے کس قسم کا متضاد اسلام قوم کے سامنے پیش کیا ہے؟

میں نے شروع میں کہا تھا کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ اسلام جن تضادات کا مجموعہ ہے انہیں یکجا کیا جائے تو اس سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے میں اس مقام پر ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ یہ صاحب "اقامت دین" کے پردے میں کس طرح اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے کھوکھلا کر رہے ہیں یہاں مصیبت یہ ہے کہ جب کوئی فتنہ شروع ہوتا ہے تو اسکی ابتدا میں اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جاتا اور اسکے بعد جب وہ پوری توانائی سے ابھر آتا ہے تو ہم شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے جب اپنی سب سے پہلی کتاب "براہین احمدیہ" شائع کی تو اس میں فتنہ "ختم نبوت" کے جراثیم موجود تھے۔ لیکن اُسوقت کسی نے اس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا اور اب وہی فتنہ قوم کے گلے کا ہار بن رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر میں "برہمو سماجی اسلام" کا تصور پیش کیا تو کسی نے اس میں چھپے ہوئے خطرہ کو نہ بھانپا۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اُسی اصول کے مطابق اب ہندوستان میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو مٹانے کی تحریکیں جاری ہیں۔ مودودی صاحب یہاں اس قسم کا سیکولر اسلام پیش کئے جا رہے ہیں تو نہ صرف یہ کہ اس فتنہ کے سدباب کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی انہیں دورِ حاضرہ کا سب سے عظیم مفکر اور مفسر قرار دیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب اسوقت تو اس اسلام کو محض نظری حیثیت سے پیش کر رہے ہیں لیکن انکے عزائم یہ ہیں کہ جب وہ اپنے مسلسل پروپیگنڈہ سے یہاں اقتدار حاصل کر لیں گے تو اس کے بعد اس اسلام کو بزور قوت منوائینگے اور جو اس سے انکار کریگا اسے مرتد قرار دیکر واجب القتل ٹھہرا دیں گے۔

قتل عام کی بنیاد

اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے اس کی منطقی کڑیاں ملاحظہ فرمایئے۔

پہلی کڑی یہ کہ مودودی صاحب جس قسم کا اسلام پیش کر رہے ہیں اس کے متعلق کہتے یہ ہیں کہ وہ خدا اور رسولؐ کا حکم ہے مثلاً ۱۹۵۶ء میں ان کے بعض رفقائے گرامی نے اعتراض کیا کہ آپ نے جماعت کی تاسیس کے وقت اسلام کے جو اصول بیان فرمائے تھے اب حصولِ اقتدار کی ہوس میں انہیں ایک ایک کر کے بدلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پر بجائے اسکے کہ یہ نادم اور معذرت خواہ ہوتے، انہوں نے جواب دیا کہ میں اگر ایسا کرتا ہوں تو یہ کونسا جرم ہے (معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ بھی تو ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مثلاً:

معاذ اللہ

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے

جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے:

اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اسکو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دیکر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن

جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش۔ امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۵۸ء)

معترضین نے کہا کہ آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جنکی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اسکے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء)

اور اس کی سند میں جس جرأت سے کام لیا اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے ارشاد ہوا:

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمدؐ بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی: (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مودودی صاحب اپنے پیش کردہ اسلام کو کسطرح خدا اور رسولؐ کا ارشاد قرار دیتے ہیں۔

اب دوسری کڑی ملاحظہ فرمائیے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اس باب میں خود مودودی صاحب کی پوزیشن کیا ہے۔ اس پوزیشن کی انہوں نے خود ہی صراحت کر دی جب کہا کہ

اسلامی نقطۂ نظر سے اقامت دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جز ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اس کی جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اسکی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ (ھدایات صہ ۳۷)

اسکے معنی یہ ہوئے کہ مودودی صاحب جس قسم کا اسلام پیش کریں گے اسکی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہوگی اور اسکی معصیت یا انکار "خدا اور رسول کے عطا کردہ اسلام سے انکار۔ اسے انکی اصطلاح میں ارتداد کہتے ہیں۔ جو لوگ ان کے اس اسلام کو نہیں مانیں گے ان کا کیا حشر ہوگا اس کے متعلق انہوں نے لگی لپٹی نہیں رکھی۔ واضح طور پر بتا دیا ہے کہ انکی سزا کیا ہوگی۔ وہ اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں لکھتے ہیں:

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام میں انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ (مرتد کی سزا صفحہ)

آپ حضرات نے دیکھا ہو گا کہ پچھلے دنوں سے یہاں ایک تحریک چلائی جا رہی ہے جسمیں کہا یہ جا رہا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس تحریک میں جماعت اسلامی پیش پیش ہے۔ ہمیں کہا یہ جاتا ہے کہ مرتد سے مراد وہ شخص ہے جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے مثلاً ہندو یا عیسائی ہو جائے لیکن درحقیقت اس سے ان حضرات کی مراد یہی نہیں، جہاں تک میری نگاہ میری راہ نمائی کرتی ہے ہماری تاریخ میں شاید ہی کوئی واقعہ ایسا گذرا ہو کہ کسی شخص نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیا اور اسے قتل کر دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس ہماری تاریخ کے اوراق ان مسلمانوں کے خون ناحق سے رنگین ہیں جو مسلمان تھے انہوں نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار نہیں کر لیا تھا۔ ہوا صرف یہ تھا کہ ایک فرقہ کے علماء کرام نے یہ فتویٰ صادر فرما دیا تھا کہ ان لوگوں کے عقائد صحیح نہیں یعنی ہمارے عقائد سے مختلف ہیں۔ اسلئے یہ مرتد ہو گئے ہیں اور مرتد کی سزا قتل ہے چنانچہ ان لوگوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ عقائد کے اختلاف کی بناء پر اس قسم کی فتویٰ بازی ہماری تاریخ کی امتیازی خصوصیت ہے اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے خود مسلمانوں کا قتل اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ انگریز کی حکومت "کافرانہ" تھی اسلئے اس کے عہد میں اس قسم کی خونریزی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا اب جو ہماری اسلامی مملکت وجود میں آئی ہے تو اس میں ان حضرات نے احیاء دین کی تحریکیں شروع کر دی ہیں اور ان میں سب سے نمایاں تحریک یہ ہے کہ عقائد کے اختلاف کی بناء پر ارتداد کا فتویٰ صادر کر دیا جائے اور پھر ایسے لوگوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ مودودی صاحب۔ اس باب میں "خورد و فروشی" کی بجائے "ٹھوک فروشی" کا مسلک اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کی اسکیم یہ ہے کہ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو یہاں کے تمام مسلمانوں کو ایک سال کا نوٹس دیدیا جائے کہ وہ مودودی صاحب کے مسلک کا اسلام اختیار کر لیں جو ایسا نہ کریں گے انہیں ایک سال کے بعد قتل کر دیا جائے۔

عزیزان من! آپ سوچئے کہ یہاں اقامت دین کے نام پر کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

والسلام

طلوع اسلام کی سولھویں سالانہ کنونشن

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا، طلوع اسلام کی سولھویں سالانہ کنونشن، ۲۲ر تا ۲۵ر نومبر ۱۹۷۳ء منعقد ہو رہی ہے۔ قارئین اس کنونشن کی روئداد سے بہرہ یاب ہونے کے لئے جسقدر متمنی ہوتے ہیں اس کا ہمیں احساس ہے، لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ اگر اس روئداد کو زیر نظر اشاعت میں شائع کیا جائے تو رسالہ کم از کم دس دن تک کے لئے مؤخر ہو جائیگا۔ اور قارئین پر یہ بھی سخت ناگوار گذرا کرتا ہے۔ اندریں حالات ہم نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ اس روئداد کو آئندہ اشاعت تک ملتوی کر دیا جائے۔

اسوقت جبکہ پرچہ پریس میں بھیجا جا رہا ہے، ادارہ، اور بزم طلوع اسلام کے اراکین، اپنے جواں سال جواں بخت ناظم، پروفیسر خالد سلام صاحب کی زیر سرکردگی، کنونشن کے انتظامات میں منہمک ہیں۔ اس سال بزم کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب معہ چند اراکین پہلے تشریف لے آئے ہیں۔ وہ بھی ان انتظامات میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ ادارہ کے سامنے، وسیع سبزہ زار میں، حسب سابق، نہایت پُرشکوہ پنڈال نصب ہو رہا ہے۔ گذشتہ برسات کے دوران، ملک میں جو تباہ کن سیلاب آئے تھے، طلوع اسلام کی بیشتر بزمیں ان کی رہگذر میں واقع تھیں۔ اس حادثہ کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ امسال مندوبین نسبتاً کم تعداد میں شریک کنونشن ہو سکیں گے۔ لیکن ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ یہ حضرات پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں شرکت کر رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کاروانِ شوق کے دل میں قرآنی کشش کسقدر شدید ہے۔ چنانچہ یہ ارباب جذب و کیف، جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔ اَھلاً وَّ سَھلاً مَرحَبًا۔ مہمانوں کا قیام، ادارہ اور اس سے متصل کوٹھی میں ہو گا جسے تحریک کے قدیم ترین رفیق اور پرویز صاحب کے حبیب مکرم، شیخ سراج الحق صاحب نے بکمال خلوص، کنونشن کے حوالے کر دیا ہے۔ مندوبین ۲۲ر نومبر کی شام تک پہنچ جائیں گے۔ پہلا کھلا اجلاس، ۲۳ر نومبر بعد نماز جمعہ ہو گا۔ اس کے بعد جمعہ کی شام، ہفتہ دوپہر (بزم مذاکرہ) ہفتہ شب (مجلس استفسارات)۔ اتوار صبح اور شام کھلے اجلاس ہونگے۔ ان اجلاسوں کے خطابات و مقالات میں سے، پرویز صاحب کا استقبالیہ اور اسلام صاحب کا مقالہ — یہ بھی شریعت، وہ بھی شریعت — زیر نظر شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے، دیگر خطابات اور مقالات، آئندہ اشاعتوں میں باصرہ نواز ہوتے رہینگے۔

طلوع اسلام کی قرآنی فکر کی یہ آواز جو چھبیس سال پہلے (یوں سمجھئے جیسے) ویرانوں میں اٹھائی گئی تھی، للہ الحمد کہ اب وہ بستی بستی، قریہ قریہ، گونج رہی ہے۔ اس دوران میں، ہنگامی تحریکوں کی سینکڑوں آندھیاں آئیں اور جھکڑ اٹھے اور تباہیاں مچاتے گذر گئے، لیکن قرآنی فکر کی یہ نسیم سحری نہایت خاموشی سے جانب منزل رواں دواں رہی اور اپنی مشام جاں نوازی سے ہر گذرگاہ کو معطر کرتی چلی گئی۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود۔

اِدارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات

(نوٹ) ان قیمتوں میں پیکنگ و ڈاک کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن - (پارہ اول)	۳/۵۰ روپے
" " (پارہ ۲ تا ۲۷) فی پارہ	۲/۲۵ "
" " (پارہ ۲۸، ۲۹) یکجا	۶/۵۰ "
" " (پارہ ۳۰)	۴/۵۰ "
" " (جلد اول و دوم) فی جلد	۳۰/- "
" " (جلد سوم)	۳۵/- "
مکمل سیٹ	۹۰/- "
لغات القرآن (جلد اول تا چہارم) فی جلد	۲۰/- "
مکمل سیٹ	۸۰/- "
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۱۰/- "
اسلام کیا ہے؟ (سستا)	۶/- "
ابلیس و آدم، جوئے نور، برق طور (فی جلد)	۱۵/- "
انسان نے کیا سوچا؟	۱۵/- "
معراج انسانیت	۲۵/- "
کتاب التقدیر	۱۵/- "
بہار نو	۵/- "
سلسبیل، فردوس گم گشتہ (فی جلد)	۱۰/- "
قائداعظم کے تصور کا پاکستان	۱۲/- "
مقام حدیث	۵/- "
اسلامی معاشرت	۴/- "
اسباب زوال امت	۲/- "
جہاد	۲/۵۰ "

نام کتاب	قیمت
قرآنی قوانین و اقدار	۴/- روپے
قرآنی فیصلے (جلد اول، دوم، سوم) فی جلد	۵/- "
مکمل سیٹ	۱۵/- "
سلیم کے نام (جلد اول، دوم، سوم) فی جلد	۱۰/- "
مکمل سیٹ (تین جلدیں)	۳۰/- "
طاہرہ کے نام	۶/- "
عربی خود سیکھئے	۶/- "
منزل بہ منزل	۸/- "
جہان فردا	۸/- "
ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION (مجلد)	۳۰/- "
(پیپر بیک)	۲۰/- "
الفتنۃ الکبریٰ (طٰہٰ حسین)	۸/- "
فجر الاسلام (جلد اول، دوم) فی جلد	۵/- "
اسلام پر کیا گذری؟ (از علامہ امین مصری)	۸/- "
قتل مرتد۔ غلام اور لونڈیاں	۲/- "
دھتکارے ہوئے انسان (عنایت اللہ)	۵/- "
جمع القرآن (علامہ تمنا عمادی مرحوم)	۲/۵۰ "
تاریخ الامت (علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم)	
(جلد اول تا چہارم) فی جلد	۳/- "
جلد پنجم و ششم (فی جلد) ۴/- روپے جلد ہفتم و ہشتم (فی جلد)	۳/- "
مکمل سیٹ	۲۵/- "
PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN. ڈاکٹر سید عبدالودود	۳۰/- "

مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور کا ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

از شاہد عادل میانوالی

اسلام میں سزائے ارتداد

جماعت اسلامی کے سنجیدہ ترجمان ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کی تین اشاعتوں میں اس عنوان سے محترم عبدالحمید صدیقی کے قلم سے (جو اس رسالہ کا افتتاحیہ لکھتے ہیں اور اس اعتبار سے اس کے مدیر ہیں) ایک اہم مضمون شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر خود مودودی صاحب کا ایک مستقل کتابچہ موجود ہے اور اس پر طلوع اسلام کے صفحات میں تبصرہ بھی شائع ہو چکا ہے[1]۔ اپنے اس نئے مضمون میں مدیر ترجمان القرآن نے کچھ نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ چونکہ یہ باتیں قتل نفس جیسے اہم موضوع سے تعلق رکھتی ہیں اسلئے ہم ان کا تجزیہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

مدیر ترجمان القرآن کا یہ سلسلہ مضامین دراصل پاکستان کے سابق چیف جسٹس۔ ایس۔ اے رحمان کی اسی موضوع پر ایک انگریزی کتاب پر تبصرہ ہے۔ رحمٰن صاحب نے اپنی اس کتاب میں قرآن و سنت، خلفائے راشدین کے عمل اور فقہاء کے فیصلوں کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ کہ اسلام میں صرف اسی مرتد کی سزا قتل ہے جو ارتداد کیساتھ "حارب اللہ و رسولہٗ" کا بھی مرتکب ہوا ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت سے بغاوت کی ہو۔ صرف مرتد پر اس دنیا میں قانوناً قتل کی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے جو آخرت میں اس کے جرم کی مناسب سزا دیگا۔ اس کے برعکس ترجمان القرآن کے مدیر یہ دعوے کرتے ہیں کہ رحمٰن صاحب نے جو کچھ نتیجہ نکالا ہے وہ قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کے فیصلوں کے خلاف ہے اور اسلامی قانون میں مجرد مذہب تبدیل کرنے سے سر قلم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید سے استدلال

مدیر ترجمان القرآن نے اپنے مزعومہ مسلک کو ثابت کرنے کیلئے بڑی لمبی چوڑی بحث کی ہے جو رسالے کے تین شماروں پر پھیلی ہے۔ اس طوالت کی وجہ سے ایک عام قاری اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ راقم کی یہ کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو بات مختصر کی جائے تاکہ کسی قسم کا الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ تو سب سے پہلے ہم اس بحث کو لیتے ہیں جس میں اس مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید سے استدلال کیا گیا ہے۔ رحمٰن صاحب نے اپنی کتاب میں قرآن مجید کی چھپن آیات پیش کی ہیں جن میں مرتد کے بارے میں یہ قرآنی حکم ملتا ہے کہ اس کی سزا اللہ تعالیٰ مرتد کو قیامت کے دن دیگا، لیکن اس دنیا میں

---

[1] یہ تبصرہ کتابچہ کی شکل میں شائع ہو چکا ہے جس کا عنوان ہے "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں" (طلوع اسلام)

قانوناً اسے کوئی سزا نہیں دی جاسکتی (صفحہ ۳۰) مضمون کی ابتداء میں ہم مودودی صاحب کے جس کتابچہ کا ذکر کر آئے ہیں اس میں مرتد کے احکامات کے بارے میں ان چھپن آیات میں سے ایک آیت بھی پیش نہیں کی گئی۔ اور پیش کیسے کی جاتی جب کہ وہ ان کے خودساختہ مسلک کو کاٹتی تھیں۔ تاہم انہوں نے اپنے کتابچے میں بطور تبرک ایک آیت ضرور درج کی تھی جس سے انہوں نے استدلال کی بھی کوشش فرمائی لیکن خود اپنی تسلی بھی نہ ہوئی اسلیئے جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ ہم قارئین کو ان کے اس استدلال سے محروم نہ کریں گے۔ پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مدیر ترجمان القرآن مرتد کے احکامات کے بارے میں ان چھپن آیات قرآنی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے امیر جماعت کے کھینچے ہوئے دائرے سے باہر نکل نہیں سکتے۔ اب دوسری طرف آیات میں مرتد کا حکم نصف النہار کی طرح روشن ہے۔ چنانچہ وہ اسے مانتے بھی ہیں اور پھر بڑی جسارت سے ان کی قانونی حیثیت کا انکار کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

> جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ان میں زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا تھا کہ دین کے ساتھ اس نوعیت کا مذاق کرنے والوں کو تنبیہ کی جاتی۔ انہیں آخرت کے عذاب النار سے ڈرایا جاتا۔ دنیا میں قبول اسلام کے نتیجے میں جو حقوق و مراعات انہیں حاصل تھیں وہ سلب کر لی جاتیں۔ ان کی مغفرت کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔ اور ان کی توبہ تک بھی قبول نہ کی جاتی۔
>
> (ترجمان القرآن بابت اگست ۷۳ صفحہ ۲۷۶/۷۸)

آگے چل کر اپنے اس استدلال کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:-

> اس کے بارے میں بھی ہمارا جواب وہی ہے جو پہلے دیا جا چکا ہے۔ معاہدہ حدیبیہ ذیقعدہ سنہ ۶ھ میں ہوا۔ اس وقت مکمل سیاسی اختیارات حضورؐ کے ہاتھ میں نہیں تھے۔
>
> (ایضاً بابت ستمبر صفحہ ۳۲۴/۳۴)

مدیر ترجمان القرآن کا یہ استدلال پڑھ کر راقم کانپ گیا کہ وہ ایک مسئلہ کا انکار کرتے کرتے تقریباً تمام اسلامی احکامات پر بھی ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ چھ ہجری یعنی نبوت کے انیسویں سال تک اکثر اسلامی احکامات نازل ہو چکے تھے۔ لیکن مدیر ترجمان القرآن کے مذکورہ بالا فرمان کی روشنی میں ان کی کوئی قانونی حیثیت ہی نہیں بنتی کیونکہ اس وقت تک مکمل سیاسی اختیارات حضورؐ کے ہاتھ میں نہیں تھے۔ سبحان اللہ! کیسا اچھوتا استدلال ہے۔ راقم کا جی چاہتا ہے کہ اسلامی نظام کے ان خودساختہ علمبرداروں سے پوچھے کہ کیا اسطرح کوئی ایسا اسلامی حکم رہ بھی جاتا ہے جس کی قانونی حیثیت باقی رہتی ہو؟

دوسرا حربہ مرتد کے احکامات کے بارے میں چھپن آیات قرآنی کو بے اثر کرنے کے لئے یہ تو مدیر ترجمان کا پہلا وار تھا۔ ان کی حیثیت مزید کم کرنے کیلئے وہ دوسرا حربہ خلط مبحث کا استعمال کرتے ہیں جسے مناسب ہوگا کہ پہلے ان کے الفاظ میں سن لیا جائے۔ فرماتے ہیں:-

> غور کیجئے کہ کیا غلبۂ دین کا عظیم الشان کام ہر کافر و مرتد کو مکمل آزادی ضمیر دے کر اور انکی سرگرمیوں کو برداشت کرتے ہوئے انجام پاسکتا ہے۔ اور اگر یہ کام کفار و مرتدین اور مشرکین

کو ادنیٰ تکلیف پہنچے بغیر ہو سکتا۔ . . تو قرآن وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ اور وَلَوْ
کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ کا اضافہ نہ کرتا۔ (ایضاً اگست صفحہ ۴۷/۴۴)

محترمی جناب مدیر صاحب ترجمان القرآن! ہم نے آپ کے فرمان کے مطابق غور بھی کیا۔ بلکہ بار بار آنکھیں پھاڑ کر بھی دیکھا، لیکن آیات کے جو ٹکڑے آپ نے نقل کیئے ہیں ان میں کفار اور مشرکین کے ساتھ کہیں مرتدین کا لفظ نظر نہیں آیا۔ ہمارے خیال میں تو جناب مدیر نے جس مقصد کیلئے مرتد اور کافر کے بارے میں شرعی احکامات کا یہ خلط مبحث کیا ہے وہ الٹا ان کے خلاف جاتا ہے۔ اسلامی قانون کفار سے معاہدے کرنے کی اجازت دیتا ہے اور خود حضور صلعم نے یہ معاہدے کئے تو اس خلط مبحث سے مرتدین کے قتل کا ثبوت تو کجا وہ الٹا اس سے بچ جاتے ہیں پھر معاہدے تو ایک معمول تھا۔ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں ان میں سے بعض کفار کی عورتوں سے شادی تک کی اجازت بھی دی ہے۔ یعنی وہ مسلمان مرد سے شادی کرنے کے باوجود اپنے پرانے مذہب یعنی یہودیت یا عیسائیت پر قائم رہ سکتی ہے۔ لہٰذا بظاہر کفار اور مرتدین کے احکامات کا یہ خلط مبحث بیکار سا نظر آتا ہے لیکن بیچارے مدیر ترجمان القرآن، مودودی صاحب کے کھینچے ہوئے دائرے میں کھڑے ہیں اور مودودی صاحب نے اس موضوع کی پوری چھپن آیات کو چھوڑ کر ایک ایسی آیت سے استدلال کیا ہے جس میں مرتدین کی بجائے کفار کا ذکر ہے جسے وہ مرتدین کے سر تھوپتے ہیں۔ سورۃ توبہ کی اس آیت کا ترجمہ مدیر ترجمان القرآن کی زبانی ہی ملاحظہ فرمائیں:-

> پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کیلئے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جانتے ہیں
> لیکن اگر وہ . . . .
> عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید کہ وہ اس طرح باز آ جائیں۔ (آیت ۱۱-۱۲) (ایضاً بابت اگست صفحہ ۴۷/۴۸)

ہوش و حواس قائم رکھنے والے مفسرین اور علمائے اسلام تو ایک طرف ساری اسلامی تاریخ میں کسی فاتر العقل مجذوب نے بھی یہ نہیں لکھا کہ اسلام قبول کرنے کیلئے کسی قسم کی قسمیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ کلمہ توحید پڑھا اور داخلِ اسلام ہوئے۔ اس لئے اس آیت میں کسی کو مرتد قرار دینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ امام فخر الدین رازی کی تحقیق کے مطابق تمام مفسرین نے اس سے نقضِ عہد مراد لیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، امام سدیؒ اور امام کلبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان کفار مکہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے حدیبیہ کے عہد کو توڑ ڈالا تھا۔ اور قبیلہ خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی تھی۔ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ عام کفار کی نسبت عہد توڑنے والے کفار سے جنگ کرنا زیادہ ضروری ہے تاکہ یہ دوسروں کیلئے باعث عبرت ہو۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۰۲)

یہی وجہ ہے کہ خود مودودی صاحب کو اپنے اس غلط استدلال پر اطمینان نہیں تھا۔ اسلئے نہیں

یہ تسلیم کرنا پڑا کہ :-

> بعض لوگ حدیث اور فقہ کی باتیں سنکر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کیلئے اگرچہ ہم نے اس بحث کے ابتداء میں قرآن کا حکم بھی بیان کر دیا ہے لیکن بالفرض یہ حکم قرآن میں نہ بھی ہوتا تو حدیث کی کثیر التعداد روایات، خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں اور فقہاء کی متفقہ رائیں اس حکم کو ثابت کرنے کیلئے کافی تھیں۔ ثبوت حکم کے لئے ان چیزوں کو نا کافی سمجھ کر جو لوگ اس کا حوالہ قرآن سے مانگتے ہیں۔ ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تمہاری رائے میں کیا اسلام کا پورا قانون تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔
>
> (مرتد کی سزا، صفحہ ۳۰)

دیکھئے کس طرح حدیث و فقہ کا نعرہ بلند کر کے اپنے ہی غلط استدلال کو گول کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ آیئے ان کے اس نعرے کی حقیقت بھی دیکھ لیں۔

احادیث سے استدلال

جو حضرات مرتد کے احکامات کے بارے میں قرآن مجید کی چھپن آیات کو بے اثر بنا سکتے ہیں ان کے آگے احادیث کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ لیکن اپنے معروف حربے کے مطابق، احادیث کا انکار تو خود کرتے ہیں (تفصیل آگے آتی ہے) لیکن بڑی دیانتدارانہ رائے سے اس کا الزام اُن اہل علم کے سر تھوپ دیتے ہیں جن کے دلائل کا وہ جواب نہیں دے سکتے۔ چنانچہ رحمان صاحب، کہ جن کی صدارت میں مودودی صاحب تقریریں کیا کرتے تھے، کو بڑے دھڑلے سے منکر حدیث قرار دینے کے لئے فرمایا جاتا ہے :-

> احادیث کے معاملے میں مصنف جو مخصوص ذہن رکھتے ہیں اہل علم اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس تمہید میں بیان کردہ امور کے بارے میں ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ انہوں نے اسے لکھ کر عام مسلمانوں کی نظر میں حدیث و سنت کے مقام کو گرانے کی کوشش کی ہے
>
> (ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۸۰)

یہ تو تھی مدیر ترجمان القرآن کی "دیانتدارانہ رائے" اب رحمان صاحب کی کتاب اٹھایئے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے کتاب کے پورے تیس صفحات پر اس موضوع کی ساری احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ اور پھر ہر حدیث کے بارے میں ائمہ حدیث کی تحقیق نقل کی ہے۔ دیانتدارانہ رائے پیش کرنے والے خدا کے لئے ذرا سوچیں کہ اگر ایک شخص حدیث کا منکر ہو کر اُسے لوگوں کی نظر میں گراتا ہے تو پھر اسے اتنی لمبی چوڑی دردسری کی کیا ضرورت تھی۔ اس دردسری کا وہی اہل علم اندازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے کبھی ان ضخیم کتابوں سے کسی خاص موضوع سے متعلق روایات چھننے کی کوشش کی ہو

اس کے برعکس، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں احادیث نبوی ؐ کا سب سے بڑا انکار خود مودودی صاحب نے کیا ہے۔ یہانتک کہ خاص اس مسئلے کے بارے میں وہ چند احادیث پیش کرتے ہیں۔ ان کے صحیح ہونیکا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان سے مرتد کے قتل کے بارے میں استدلال بھی کرتے ہیں، اور قارئین حیران ہونگے

کہ اس کے بعد ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان تفصیلات کو نقل کرنے سے پہلے ہم انکار حدیث کے بارے میں ان کا وہ اصول نقل کرتے ہیں جس کا سہارا لیتے ہوئے وہ اکثر اوقات صحیح احادیث کو کھوٹے سکے کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ انہی کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اسکی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے۔ اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح روح محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اور وہ اس طرح دیکھتا ہے اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا دارومدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معطل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اسلئے کہ اسکے جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات جلد اول صفحہ ۲۹۶)

اپنے اس اصول کی روشنی میں مودودی صاحب نے جس طرح عملاً صحیح احادیث کا انکار کیا ہے۔ اس کی تفاصیل راقم نے مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کے تبصرے میں جمع کر دی ہیں جو پوری چھ اقساط میں طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ خود اس مسئلہ میں انہوں نے اپنے کتابچہ "مرتد کی سزا" کے صفحہ ۱۶ اور ۱۷ پر مرتد کے قتل کے ثبوت میں ایسی احادیث پیش کی ہیں جن میں حضور صلعم نے مرتد عورتوں کو قتل کرا دیا تھا۔ ان احادیث کو صحیح قرار دیئے اور پھر ان سے اپنا مطلب نکال لینے، یعنی مرتد کے قتل کا جواز ثابت کرنے کے بعد انہیں کھوٹے پیسے سے بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اور پھر اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں ان احادیث کا انکار کر کے رسول اللہ صلعم کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں علمائے بلخ کا دامن تھامتے ہوئے یہ فتوے دیتے ہیں کہ مرتد عورت کا قتل کرنا تو کجا سرے سے اس کا نکاح بھی نہیں ٹوٹتا"

(جلد پنجم صفحہ ۴۴۳)

بھلا کیا یہ ممکن تھا کہ مدیر ترجمان القرآن، مودودی صاحب کے قائم کردہ اس سنہرے اصول سے سرمو انحراف کر سکیں۔ چنانچہ اس بارے میں وہ بھی صحیح احادیث کا انکار کر دیتے ہیں اور اس کے مقابلے

میں ضعیف احادیث کا سہارا لیتے ہیں پہلے دیکھیے کہ ایک حدیث کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد کس خوبصورتی سے اس کا انکار کرتے ہیں :-

> صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے اسی مفہوم کی ایک روایت ملتی ہے۔ کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایک بدو نے قبول اسلام کیا اور اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھایا۔ لیکن جلد ہی سخت بخار میں مبتلا ہو گیا۔ واپس آیا اور بیعت کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ اس نے تین بار یہ مطالبہ کیا لیکن ہر بار انکار کر دیا گیا۔ بالآخر وہ چلا گیا۔ اس شخص کو رسولؐ پاک نے قتل نہیں کیا بلکہ صرف اتنا فرمایا کہ مدینہ کی مثال ایک بھٹی کی ہے جو کھوٹ کو اصل سے الگ کر دیتی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارا مؤقف یہ ہے کہ یہ واقعہ اسلامی حکومت کے باقاعدہ قیام سے پہلے کا ہے اور حدود کا نفاذ اسلامی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ (ترجمان القرآن بابت ستمبر صفحہ ۲۲۳/۳۵)

بہت خوب! انکار حدیث میں مدیر ترجمان القرآن اپنے امیر سے بھی سبقت لے گئے۔ جس حدیث سے انکار کرنا ہو جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ اسلامی حکومت کے باقاعدہ قیام سے پہلے کی بات ہے اور جس کی کم از کم مدت وہ نبوت کے انیسویں (۱۹) سال تک شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح، جیسے انہوں نے قرآنی احکامات کی قانونی حیثیت ختم کر دی تھی ویسے ہی حجیت حدیث پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔ چنانچہ مرتد کے حکم کے بارے میں واضح اور صحیح حدیث کا انکار کرنے کے بعد وہ مندرجہ ذیل ضعیف روایت کا سہارا لیتے ہیں :-

> عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے کچھ لوگوں کو آگ میں ڈال کر جلا دیا جو اسلام سے پھر گئے تھے۔ جب یہ خبر عبداللہ بن عباسؓ تک پہنچی تو انہوں نے کہا کہ میں تو ان کو آگ میں ہرگز نہ جلاتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ لَا تُعَذِّبُوا بِعَذَابِ اللّٰہِ۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے تحت۔ کہ جو اپنا دین بدل ڈالے اسے قتل کر دو، انہیں قتل کر دیتا۔ (ایضاً بابت اکتوبر صفحہ ۲۳/۵)

خوب رہی! نعوذ باللہ حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو جو خلفائے راشدین میں سے تھے اتنا بھی علم نہیں تھا کہ آگ میں جلانا اسلام میں حرام ہے۔ مدیر صاحب کچھ تو خوف خدا کیجیئے اگر خلفائے راشدین کو اسلام کے حرام و حلال کا بھی علم نہیں تھا تو پھر اسلامی قانون کی کیا حیثیت رہتی ہے۔ جب حضرت حسینؓ کو اس اختراع کا پتہ چلا تو انہوں نے عکرمہ کو اپنے دروازے پر باندھے رکھا۔ مشکوٰۃ (نور محمدی ص ۶۱۱) تک میں یہ تصریح ہے کہ امام قاسم، عکرمہ کو بہت بڑا جھوٹا قرار دیتے تھے۔ قَالَ الْقَاسِمُ هُوَ كَذَّابٌ۔ سعید ابن مسیب بھی اسے کذاب ہی کہتے ہیں۔ سلیمان بن سعد کی روایت کے مطابق تو اس کا جنازہ تک نہ پڑھا گیا تھا۔ اسماء الرجال کی مشہور کتاب "میزان الاعتدال" (جلد دوم صفحہ ۲۰۹) میں عکرمہ کے کیریکٹر کی بابت یہاں تک لکھا ہے کہ وہ قمار باز تھا۔ فسق و فجور کی باتوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا اور گانا بھی سنتا تھا۔ وغیرہ۔

لیکن چونکہ مدیر ترجمان کا واحد سہارا یہی ضعیف روایت ہے اس لئے وہ اس حقیقت سے قطع نظر کر اس روایت سے ایک خلیفہ راشد کی شان پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ عکرمہ جیسے کذاب راوی کی یوں صفائی پیش کرتے ہیں:

> رہ گئی یہ بات کہ عکرمہ کی طرف کس نے کذب کی نسبت کی ہے اور وہ حضرت علیؓ کے خلاف جھوٹی روایات وضع کیا کرتے تھے تو اس معاملے میں ہمیں یہ اصول ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ کسی راوی کی ثقاہت وعدم ثقاہت کا فیصلہ اس کے بارے میں اکثریت کی رائے دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ چند اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ معاصرت کا فتنہ بڑا قدیم ہے اور اہل علم میں باہم چشمک ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اُس وقت کے سیاسی و معاشرتی حالات کے بھی کچھ تقاضے تھے۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۲)

یعنی ائمہ حدیث کی ایک جماعت عکرمہ میں جھوٹ، فسق و فجور، قمار بازی وغیرہ کی خرابیاں گنوار رہی ہے اور مدیر ترجمان القرآن اس کی صفائی پیش کر رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر جہاں ان کے مذکورہ بالا اصول کا صحیح انطباق ہوتا ہے۔ محض ایک سنی سنائی بات پر امت کے ایک جلیل القدر راوی کو رد کر دیتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مدیر ترجمان نے جو اوپر اصول بیان فرمایا ہے اسکا استعمال زیادہ تر علمائے احناف کے خلاف کیا گیا ہے۔ کیونکہ ائمہ حدیث ان کو اصحاب الرائے قرار دیتے تھے یہاں تک کہ حنفی فقہ کے بڑے ائمہ تک کے بارے میں انہوں نے بڑے ہی نازیبا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انہی میں سے ایک مشہور ہستی حنفی فقہ کے مشہور امام محمد کے استاد بکیر بن عامر البجلی ہیں۔ وہ اپنی کتاب جامع صغیر میں اپنے ان استاد سے احادیث روایت کرتے ہیں۔ خود امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ الکبیر۔ (مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ جلد اول کے صفحہ ۱۱۵) پر انہیں معتبر راوی قرار دیا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کے ہر اہل قلم نے انہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں ایسی دو احادیث بیان فرمائی ہیں جن کے مطابق حضور صلعم نے زمین کی بٹائی کے معاملے کو سود قرار دیا ہے امام ابوداؤد ان دونوں احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اب مودودی صاحب حضور صلعم کے اس فیصلے کے خلاف بٹائی کو نہ صرف جائز قرار دیتے ہیں بلکہ اس کے جواز کیلئے مسئلہ ملکیت نامی کتاب لکھی۔ لیکن یہ دونوں صحیح احادیث ان کے غلط مسلک کی جڑ کاٹتی تھیں۔ اسلئے انہیں ٹھکانے لگانا ضروری تھا ان میں سے ایک حدیث کے راویوں میں بکیر بن عامر البجلی تھے جن کے متعلق انہیں کہیں سے بے سند یہ لفظ مل گیا کہ "ھو متکلم فیہ" کہ اس کے بارے میں کلام کیا گیا ہے راقم نے اس مقصد کیلئے اسماء الرجال کی تمام کتابیں دیکھیں لیکن یہ فقرہ کہیں نہ ملا لیکن مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے دوسرے تمام اہل قلم نے حنفی فقہ کے ایک امام کے اس استاد کو غیر معتبر قرار دے کر دونوں ہی احادیث کو رد کر دیا۔ یہ بھی ان کا بڑا انوکھا اقدام تھا کہ ایک حدیث کے راوی پر کلام کرتے ہیں اور دوسری صحیح حدیث کو "جھونگے" میں رد کر دیا گیا۔ حالانکہ کسی نے بکیر بن عامر البجلی کی بابت یہ اڑتی ہوئی بات کہدی تھی تو مدیر ترجمان کو اپنا اصول عکرمہ جیسے کذاب کے

دفاع کی بجائے امام محمدؒ کے استاد کی ہدایات میں استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ اور پھر ان کی روایت کردہ احادیث کو عقل کی کسوٹی پر بھی تو پرکھا جا سکتا ہے کہ بٹائی کا معاملہ سود بنتا ہے اور اب تو (KEYNES) جیسے ماہر معاشیات نے بھی اس کے بارے میں یہی فیصلہ دیا ہے۔

(اسلام اور سود مصنفہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی صفحہ ۸۹)

سزائے قتل محاربہ و فساد فی الارض کیلئے ہے

یہ تو تھی ان کے واحد سہارے ضعیف حدیث کی حیثیت۔ اب ان کے اس اعتراض کو لیجئے۔ کہ مرتد کے قتل کیلئے جو "حارب اللہ و رسولہ" کی قید لگائی جاتی ہے اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں۔ فرماتے ہیں:۔

> جناب رحمٰن نے بخاری ہی کی ایک اور حدیث اور بعض دوسرے مقامات جہاں حربی یا حارب کا لفظ ان کی نظر پڑا اسے اس سے استدلال کرتے ہوئے خلط مبحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ سزائے قتل محاربہ و فساد فی الارض کیلئے ہے۔ ارتداد عن الاسلام کیلئے نہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ محاربہ و فساد فی الارض بھی موجباتِ قتل میں سے ہے اور اسلام سے ارتداد و انحراف بھی ایک شخص کے قتل کو واجب کر دیتا ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا کرنے کیلئے کوئی مضبوط بنیاد ہونی چاہیئے۔ بیسویں صدی کے چند اشخاص کی خواہش وہ بنیاد نہیں بن سکتی۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۷۲ء صفحہ ۳۲۱/۳۴۳)

معلوم نہیں مدیر ترجمان نے کبھی احادیث کا مطالعہ بھی فرمایا ہے یا وہ جان بوجھ کر اپنے قارئین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اس موضوع پر اکثر احادیث میں یہ قید موجود ہے۔ اور یہ قید کسی بیسویں صدی کے شخص کی خواہش" نہیں بلکہ خود حضور صلعم کا فرمان ہے اور فقہاء امت نے اسی کے مطابق فیصلہ دیا ہے۔ اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم تمام احادیث تو نقل نہیں کر سکتے صرف ایک پر اکتفاء کرتے ہیں اور نیل الاوطار جلد ۷ کے صفحہ ۷ سے ہم سنن نسائی کی ایک حدیث کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جس میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ تین صورتوں کے بغیر کسی مسلمان کا خون جائز نہیں۔ یہ کہ وہ شادی شدہ ہو اور زنا کرے اسے سنگسار کیا جائے۔ دوسرا قتل عمد۔ اور تیسرا یہ کہ دین اسلام چھوڑ کر اللہ اور رسول سے جنگ کرے۔ ایسے شخص کو قتل کر دینا چاہیئے یا پھانسی پر لٹکایا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔

دیکھئے یہاں "تین" کے الفاظ ہیں اور تیسرا مرتد ہے جس کے ساتھ خود حضور صلعم حارب اللہ و رسولہ کی قید لگائی ہے۔ خیال رہے کہ ایسی احادیث میں نہ خالی محاربہ مراد لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی خالی مرتد کیونکہ حدیث میں تین کے الفاظ ہیں۔

قرآن و سنت کے ساتھ مدیر ترجمان القرآن کے اس سلوک کے بعد اب خلفائے راشدین کے زمانہ

خلفائے راشدین اور ارتداد

کیطرف آئیے۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قبائلِ عرب کے ارتداد کا واقعہ مشہور ہے۔ رحمٰن صاحب اپنی کتاب میں تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مرتد "محاربِ اللہ و رسولہ" کے بھی مرتکب ہوئے تھے یعنی باغی تھے۔ مدیر ترجمان القرآن اعتراض برائے اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

> ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ہنگامہ ارتداد وسیع پیمانے پر برپا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں جرمِ بغاوت کا ارتکاب بھی کیا گیا۔ مگر خلیفہ راشد کی نظر میں اہم تر فتنہ، فتنۂ ارتداد ہی تھا اور اسی کی سرکوبی کیلئے پوری سرگرمی دکھائی۔ اب اگر کوئی صاحب کہیں کہ محض ارتداد کی سرکوبی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی بلکہ بغاوتوں کو فرو کیا گیا تھا تو انہیں ہر قبیلے کے بارے میں ثابت کرنا ہوگا کہ اس کے فلاں فلاں باغیانہ اقدامات کی بناء پر اس کے خلاف جہاد و قتال کیا گیا۔ مؤرخینِ اسلام جہاں اور معمولی معمولی باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں مرتد قبائل کے باغیانہ اقدامات سے اگر وہ فی الواقع کئے گئے ہوتے، صرفِ نظر نہیں کر سکتے تھے،
>
> (ایضاً صہ ۲۹۳)

جناب رحمٰن صاحب نے تاریخ طبری اور دوسری معتبر کتابوں کے حوالے دیکر ثابت کیا ہے کہ تمام قبائل "محاربِ اللہ و رسولہ" کے مرتکب ہوتے تھے۔ مدیر ترجمان نے بھی بار بار اپنے مطلب کے طبری کے حوالے دیئے ہیں۔ اگر وہ ان مقامات کو دیکھتے تو ان کی تسلی ہو جاتی۔ اگر بالفرض ان کی تاریخ طبری سے تسلی نہیں ہوتی تو ہم تاریخ ابن خلدون (جلد دوم صفحہ ۶۲) سے ویسا ہی تاریخی ثبوت مہیا کئے دیتے ہیں۔ فَوَثَبَ بَنُوْ ذُبْیَانَ وَ عَبْسٌ عَلٰی مَنْ فِیْهِمْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ جَعَلَ ذٰلِكَ غَیْرُهُمْ مِنَ الْمُرْتَدِّیْنَ۔ (حضور صلعم کی وفات کی خبر سنتے ہی قبیلہ بنو ذبیان اور عبس اپنے اپنے قبیلوں کے بقیہ مسلمانوں کو (جنہوں نے مرتد ہونے سے انکار کر دیا تھا) پر پل پڑے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے تمام مرتدین نے بھی اپنے اپنے قبیلے کے مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اگر وہ تاریخ طبری کو کھولنے کی زحمت فرمائیں تو انہیں اس کی (جلد ۲ کے صفحہ ۱۸۷۷) پر بالکل ہوبہو یہی عبارت ملے گی۔ اور اگر وہ اس واقعہ کو پڑھتے جائیں تو انہیں آگے تمام قبائل کے نام بھی مل جائیں گے اور ان کے جرائم کی تفصیلات بھی۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ ساری تفصیلات نقل نہیں کر سکتے۔ مثلاً طبری کی اسی جلد کے صفحہ ۱۹۰۰ پر ہے کہ جب قبائل اسد، غطفان، ہوازن، سلیم اور طئی کو شکست ہو گئی تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے انہیں معافی دینے سے انکار کر دیا جب تک کہ وہ ان لوگوں کو پیش نہ کریں جنہوں نے مرتد ہونے کے بعد مسلمانوں کو آگ میں جلایا۔ ان کا مثلہ کیا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔

یہی نہیں بلکہ ہمارے فقہاء بھی یہی کچھ فرماتے ہیں۔ مشہور حنفی امام علامہ عینیؒ بخاری کی شرح

جلد اول کے صفحہ ۲۳۶ پر فرماتے ہیں وَ اِنَّمَا قَاتَلَ الصِّدِّیْقُ مَانِعِی الزَّکٰوۃَ لِاَنَّھُمْ امْتَنَعُوْا بِالسَّیْفِ وَ نَصَبُوْا الْحَرْبَ لِلْاُمَّۃِ - حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے اس لئے جہاد کیا کہ انہوں نے تلوار کے ذریعے سے زکوٰۃ کو رد کیا اور مسلمانوں کے لئے لڑائی کا بازار گرم کیا۔

مشہور مرتد جبلہ بن ایہم کا واقعہ

حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آتا ہے جن کے بارے میں مدیر ترجمان القرآن تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بڑے باریک بین اور شریعت کے بارے میں محتاط شخصیت تھے۔ (ایضاً بابت اکتوبر ۶۳ء ص ۲۹/۳۱) آیئے دیکھیں کہ وہ اپنے دور کے مشہور مرتد جبلہ بن ایہم کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے۔ وہ اپنے پانچ سو سواروں کے ساتھ مرتد ہو کر شاہ روم کے پاس چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دوبارہ اسلام میں لانے کے لئے اپنی بیٹی تک کا رشتہ دینا منظور کر لیا تھا۔ صاحب عقد الفرید ابن عبد ربہ نے اپنی کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۰۱ پر جبلہ بن ایہم کے ارتداد اور حضرت عمرؓ کے اسے دوبارہ اسلام میں لانے کے واقعہ کی بڑی لمبی چوڑی تفصیلات نقل کی ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ شاعرِ رسولؐ، حضرت حسان بن ثابتؓ جن کے متعلق حضور صلعم نے فرمایا تھا کہ روح القدس آپ کے ساتھ ہے، نے اسی جبلہ بن ایہم مرتد کی شان میں ایسے ایسے قصیدے کہے جن سے یہ "مرتد" زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ اور پھر ان قصیدوں کے بدلے میں اس "مرتد" سے انعام و اکرام قبول کرتے تھے اور لطف کی بات ہے کہ وہ بھی حضرت عمرؓ جیسی شریعت کے بارے میں محتاط شخصیت کی وساطت سے وصول کرتے تھے۔ اور جب حضرت عمرؓ ہی کی مجلس میں کسی صاحب نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو جبلہ مرتد کی شان میں قصیدہ کہنے سے ٹوکا تو اس کا جواب انہوں نے دیا اسے مدیر ترجمان القرآن عقد الفرید کی جلد اول کے صفحہ ۱۰۱ پر خود ہی پڑھ لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔

یہ ہے خلفائے راشدینؓ اور شاعر رسالتؐ کا فیصلہ۔ اس بارے میں راقم زیادہ تفصیلات میں جانا تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ مدیر ترجمان القرآن فقہا کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اب ہم اس کی جھلک دکھاتے ہیں۔

سزائے ارتداد اور فقہاء

ہمارے فقہاء رحمہم اللہ مدیر ترجمان القرآن کی طرح قرآن مجید کی اس بارے میں چھپن آیات، صحیح احادیث اور خلفائے راشدین کے عمل کے خلاف جا ہی نہیں سکتے تھے۔ اسلئے انہوں نے اس بارے میں بڑا واضح فیصلہ دیا کہ صرف وہی مرتد واجب القتل ہو گا جو محارب اللہ و رسولہ کا مرتکب ہو گا۔ رحمان صاحب نے اس بارے میں فقہاء کے بہت سے مستند اقوال پیش کئے ہیں۔ ان میں سے مدیر ترجمان حنفی فقہ کے مشہور متداول کتاب ہدایہ کا یہ فقرہ لے کر غلط مبحث کی کوشش کرتے ہیں۔ وَ لِاَنَّہٗ

كَافِرٌ حَرْبِيٌّ بَلَغَتْهُ الدَّعْوَةُ ۔ اور مرتد کو قتل کیا جائے گا کیونکہ وہ حربی کافر ہے جسے دعوتِ اسلام پہنچ گئی ہے۔ یہ فقرہ اپنا مفہوم دینے میں بڑا واضح ہے۔ اگر کسی ٹیڑھے ذہن کو اس کے سمجھنے میں دقت ہو رہی تھی تو صاحب ہدایہ نے اگلی سطور میں اسکی مزید وضاحت کر دی ہے جب وہ فرماتے ہیں کہ نبی صلعم نے عورتوں کے قتل سے منع فرمایا اور سزا کے بارے میں شرعی اصول یہ ہے کہ قیامت کے دن کیلئے مؤخر کر دیا جائے۔ کیونکہ دنیا میں سزا دینا ایک حیثیت سے ابتلاء کی حقیقت کو توڑنا ہے۔ تاہم بعض دفعہ اس اصول کے خلاف دنیا میں سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ پیدا ہونے والی برائی کو روکنے کے لئے ہو جو اس صورت میں جنگ اور لڑائی ہے۔ چونکہ عورتوں میں پیدائشی طور پر مردوں کی طرح جنگی صلاحیت نہیں ہوتی اسلئے انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (ایضاً) لیکن مدیر ترجمان القرآن، صاحب ہدایہ کی اپنی اس تشریح پر پردہ ڈالتے ہوئے ان کی ایک دوسری شرح اٹھاتے ہیں۔ یہ شرح حنفی فقہ ہی کے ایک مشہور امام علامہ ابن ھمام کی ہے۔ جو شرح فتح القدیر کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہاں بھی چونکہ علامہ ابن ھمام کی شرح ان کے مزعومہ مسلک کے خلاف جاتی تھی اس لئے وہ اس شرح سے بھی آنکھیں بند کرتے ہوئے اس کے حاشیہ پر مختصر نوٹ عنایہ کا ناکام سہارا لیتے ہیں۔ اور اس عبارت سے کافر حربی کی تعریف میں کھینچ تان کی کوشش کرتے ہیں اور بیچارے اس کھینچ تان میں یہ بھول جاتے ہیں کہ خود اپنے مسلک کے خلاف جا رہے ہیں۔ عنایہ کا حاشیہ یوں ہے۔ اِنَّ اَلْمُرْتَدَّ كَافِرٌ ۔ ۔ ۔ مرتد لامحالہ کافر ہے نہ اسے مستامن سمجھا جائے گا کہ اس نے کوئی امان طلب نہیں کی اور نہ ذمی ہی قرار دیا جائے گا کہ اس سے جزیہ بھی نہیں قبول کیا جاتا لہذا وہ حربی ٹھہرا" (ترجمان القرآن ستمبر ۷۳ء ص ۳۳)

پہلی بات تو یہ ہے کہ مدیر ترجمان نے فکان حربیاً کا ترجمہ لہذا وہ حربی ٹھہرا" غلط کیا ہے۔ اس کا سادہ سا ترجمہ یہ ہے کہ "وہ حربی ہے" اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر مرتد کافر امان طلب کر لے تو پھر وہ مستامن ہو جائے گا۔ اس صورت میں بھی اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی مدیر ترجمان کی کھینچ تان بھی ان کے خلاف ہی گئی حالانکہ اگر اس بارے میں حق بات معلوم کرنا چاہتے تو حنفی فقہ کی مستند کتاب ہدایہ کے الفاظ اور پھر اس کی تشریح ان کے لئے کافی تھی۔ اگر اس سے تسلی نہ ہو رہی تھی تو پھر اس کی شرح فتح القدیر جو انہوں نے عنایہ کے حوالے کے لئے اٹھائی تھی۔ اس میں صرف عنایہ کا حاشیہ ہی کافی نہ سمجھ لیتے بلکہ اس کے نیچے علامہ ابن ھمام کی اس تشریح پر بھی ایک نظر ڈال لیتے:۔

مرتد کو اس کے کفر اختیار کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے جنگ کے شر کو رفع کرنے کیلئے قتل کیا جائیگا۔ کیونکہ مجرد کفر کی سزا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوگی جو اس سے زیادہ ہے۔ اس لئے قتل کا حکم صرف اسی سے مخصوص ہے جس میں جنگی قابلیت ہو اور وہ مرد ہے اس لئے رسول اللہ صلعم نے

عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ وہ جنگ نہیں کرتیں۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ۴ صفحہ ۳۸۹)

عنایہ کا مذکورہ بالا حوالہ ڈھونڈتے ہوئے اصل کتاب کا مذکورہ بالا حوالہ بھی مدیر ترجمان القرآن کی نظر سے یقیناً گذرا ہوگا۔ اور رحمٰن صاحب نے بھی اپنی کتاب میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ حنفی فقہ کے اس واضح فیصلے کے باوجود مدیر ترجمان القرآن اور ان کے امیر مودودی صاحب کا یہ دعوٰے کرنا کہ فقہاء کا ان کے مزعومہ غلط مسلک پر اجماع ہے عجیب وغریب ہے۔ معلوم نہیں ان حضرات کے اس طرز عمل کے بارے میں کیا کہا جائیگا؟

موجودہ زمانے کے علمائے اسلام کا فیصلہ

موجودہ زمانے کے اہل علمائے اسلام نے بھی وہی فتوٰی دینا تھا جو قرآن وسنت خلفائے راشدین کے عمل اور فقہاء کرام کے فیصلوں کے مطابق ہوتا۔ چنانچہ اس سلسلے میں رحمٰن صاحب نے موجودہ دور کے ایک بہت بڑے عالم دین شیخ محمد شلتوت کا فتوٰی نقل کیا ہے۔ لیکن جو حضرات قرآن حکیم کی پوری چھپن آیات کو گول کر جائیں ان کے لئے شیخ الازہر کا فتوٰی کیا حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسے ان الفاظ میں رد کرتے ہیں:-

> رہ گئے شیخ محمد شلتوت تو انہوں نے اگر کہا بھی ہو کہ عملاً مخالفت و بغاوت ہی کے نتیجے میں کسی کو قتل کیا جاسکتا ہے تو وہ ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتے۔ اسلامی عقائد و تعلیمات کا اثبات و تحقیق اس سے بہت بلند ہے کہ پوری امت مسلمہ کے اتفاق و توفیق کو نظر انداز کر کے دور حاضر کے چند دانشوروں کی بات مان لی جائے۔ (ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۷۳ء صفحہ ۵۲)

جب یہ حضرات اس بارے میں بار بار پوری امت مسلمہ کے اتفاق کا دعوٰے کرتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے ہٹلر کے مشہور وزیر گوبلز کو اپنا امام بنا لیا ہے کہ کوئی جھوٹ سو دفعہ بول لو وہ سچ بن جائیگا۔ ورنہ امت مسلمہ کا جو فیصلہ ہے وہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں اور وہ صرف اسی مرتد کو واجب القتل قرار دیتے ہیں جو ارتداد کے ساتھ محارب اللہ و رسولہ کا بھی مرتکب ہوا ہے۔

ضمناً عرض ہے کہ علامہ محمود شلتوت اس صدی کے وہ خوش نصیب عالم دین ہیں جنہیں دنیائے عرب کے علماء نے ان کی زندگی میں "الامام الاکبر" کا خطاب دیا اور ساری اسلامی دنیا میں ان کے فتاوی سند سمجھے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ انہوں نے قرآن وسنت سے ہٹ کر ایک لفظ بھی نہیں کہا، تاہم وہ زمانے کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے اس لئے اپنے فتاوی میں ان کا لحاظ بدرجہا اتم رکھتے تھے۔ لیکن غور کیجئے کہ مدیر ترجمان القرآن، الامام الاکبر جو الازہر یونیورسٹی کے شیخ بھی تھے کو محض دانشور قرار دیکر رد کر رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں اپنے

امیر مودودی صاحب کے سورہ توبہ کی تیرھویں آیت کے غلط استدلال کا جھنڈا اٹھا کر قرآن مجید کی پوری چھپن آیات کو گول کر جاتے ہیں۔ اور پھر مودودی صاحب نے جو "اچھوتا مفہوم" بیان کیا ہے پوری امت مسلمہ کے کسی عنصر تو کجا ملت اسلامیہ کے کسی فاتر العقل شخص نے بھی پیش نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خود مودودی صاحب کو اپنے اس غلط استدلال پر پوری طرح اطمینان نہیں اسلئے، وہ اسے گول کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں جس کی تفصیلات صفحات گذشتہ میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اس کے برعکس شیخ الازہر کا فتویٰ قرآن وسنت کے عین مطابق اور خلفائے راشدین کے عمل اور فقہائے اسلام کی روشنی میں تھا۔ اگر مدیر ترجمان القرآن معاف فرمائیں تو کیا میں ان سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟ وہ یہ کہ کیا ان کے نزدیک "پوری امت مسلمہ" سے مراد... مودودی صاحب کی ذات" تو نہیں؟ بَيِّنُوْا وَ تُوجِرُوْا۔

دل کی بات

اور آخر میں مدیر ترجمان القرآن نے دل کی بات کہہ ہی دی۔ ہم شروع سے کہہ رہے ہیں کہ جماعت اسلامی وقتاً فوقتاً یہ مسئلہ مرتدین کے لئے نہیں اٹھاتی بلکہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان مسلمانوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے ہے کہ جو ان سے اختلاف کی جسارت کریں۔ چنانچہ وہ اپنے تین اقساط کے مبسوط مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:۔

> ہماری نائے میں رحمان صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ان لوگوں کو تقویت پہنچائی ہے جو مسلمان کہلا کر عملاً اسلام سے ارتداد وانحراف کی زندگی لبسر کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی عقائد و تعلیمات سے انکار کے باوجود مسلم معاشرے سے اپنے کو چپکائے رکھنے پر مصر ہیں (ایضاً صفحہ ۳۳)

مدیر ترجمان کے اس اختتامیے میں "عملی ارتداد" کے لفظ قابل غور ہیں۔ یعنی ان کا حریف اپنے مسلمان ہونے کا لاکھ دعوے کرتا رہے۔ یہ "عملی ارتداد" کی آڑ میں اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔ مدیر ترجمان القرآن نے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی۔ جماعت اسلامی کی پالیسی ہی یہی ہے۔ اور خود مودودی صاحب شروع سے یہی اعلان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کا یہ اعلان ان ہی کی زبانی سن لیجئے:۔

> میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے۔ (وَ اللہُ الموفق للصواب) کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے اجتماعی نظام سے باہر نکل جائیں اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض

واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کیلئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (مرتد کی سزا صفحہ ۷۶)

خدانخواستہ اگر کبھی جماعت اسلامی کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو اس نے تو یہی کچھ کرنا ہے۔ ہم ان اہل علم سے گذارش کرتے ہیں کہ جو ایسے خطرناک مسائل میں جماعت کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ انہوں نے "حب علی یا بغض معاویہ" کی بنا پر یہ دو دھاری تلوار ان کے ہاتھ میں دے دی تو پھر وہ یاد رکھیں کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ خود اس کی کاٹ سے محفوظ نہ رہیں گے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/28

شاہکارِ رسالت

عمرؓ فاروق

(اپنے انداز کی منفرد کتاب جس کی مثال ہماری تاریخ میں نہیں ملتی)

- اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ اسلامی نظامِ مملکت نظری طور پر تو قرآن مجید میں موجود ہے لیکن کیا وہ کبھی عملاً متشکل بھی ہوا تھا؟
- یہ نظام مکمل طور پر عہد فاروقی میں متشکل ہوا تھا لیکن یہ اس انداز سے کبھی سامنے نہیں لایا گیا۔
- اس کی بڑی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مفکرِ قرآن پرویز صاحب برسوں سے مصروفِ تحقیق تھے

الحمد للہ

- کہ انہوں نے اپنی تحقیق کے نتائج اپنے مخصوص مفکرانہ اور شگفتہ انداز میں اپنی اس مایۂ ناز تصنیف میں پیش کر دیئے ہیں۔
- دوسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ وہ نظام آگے کیوں نہ چلا اور حقیقی اسلام مروجہ اسلام میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- اس نہایت اہم اور مشکل سوال کا جواب بھی اس کتاب میں آ گیا ہے جو مصنف کی دقتِ نظر، محققانہ کاوش اور قرآنی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔
- حدیث۔ فقہ۔ تاریخ۔ تصوّف۔ کشف والہام۔ دعوائے ماموریت وختمِ نبوتؐ کے متعلق تاریخی اور تنقیدی مباحث، بصیرت افروز حقائق اور حقیقت کشا معلومات

بڑے سائز کی ضخامت قریب چھ سو صفحات۔ اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ دلکش گرد پوش

دہوش رُبا گرانی کے باوجود قیمت ۳۵/۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

(کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے کتاب محدود تعداد میں چھاپی گئی ہے اس لئے اسے جلد حاصل کر لیجئے۔)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

بقیہ باب المراسلات صفحہ ۶۲ سے آگے

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ (۱۵/۴۲) بیشک جو اللہ کے مخلص بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا اور نہ ہی میرا غلبہ اُن پر ہو سکیگا۔

تو پھر برادرانِ عزیز! آپ خود ہی اپنے دل سے پوچھئے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے بڑھ کر بھی کوئی عبدِ مخلص ہے۔ اور کیا خالقِ مطلق کے واضح فتوی کے باوصف اور ابلیس کے اپنے اعتراف کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور جیسی ہستی پر شیطان کے غلبہ سے نماز میں "نسیان" لاحق ہو سکتا ہے جس کے کفارہ کیلئے وہ سجدہ سہو ادا کرتے تھے۔ یہ ہے نمونہ اُس مایہ ناز تفسیر تفہیم القرآن کا جس کی تکمیل پر جشنِ مسرت منایا گیا اور جسے انسانیت پہ ایک عظیم احسان قرار دیا گیا۔ آخر میں میں شمع قرآنی کی روشنی میں جسے طلوعِ اسلام نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا ہے محولا بالا سورۃ "الاعلیٰ" کی آیات کا ترجمہ و مفہوم پیش کرتا ہوں۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۔ (۸۷/۶) (اے محمدؐ) ہم قانونِ الٰہی (قرآن) کو تیرے سینہ میں اسطرح جمع و محفوظ (ثبت) کر دیں گے کہ تو اُسے کبھی بھول نہیں سکے گا (ترک نہیں کر سکے گا) اور پھر تائید و تاکید کیلئے کہا۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۔ (۸۷/۷) اور خدا نے ہرگز ایسا نہیں چاہا کہ قانونِ الٰہی (قرآن) کبھی بھی تیرے قلب و نگاہ سے محو ہو سکے۔

اس آیت میں اِلَّا استثنا کیلئے نہیں بلکہ جو حقیقت آیت نمبر (۸۷/۶) میں بیان کی گئی ہے اُسکی تائید و تاکید کے لئے آیا ہے عربی دان اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے تراجم اور تفاسیر بالکل غلط اور گمراہ کن ہیں۔ جو مودودی صاحب نے اپنی تصنیف تفہیم القرآن میں پیش کئے ہیں؛ علمِ تفسیر کا اصل سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے باقی سب بتانِ آذری۔۔۔۔۔!

(حسن عباس رضوی)

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دوکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز

پر تشریف لائیے

ڈیلرز۔ موٹر پارٹس، ٹرک (ڈیزل)، پارٹس سپیشلسٹ۔ ڈاج، بیڈفورڈ، لی لینڈ، بی۔ایل۔ایم۔سی۔

۱۳۵ بادامی باغ لاہور ٹیلیفون ۶۹۰۱۵

ضرورتِ رشتہ

دو دوشیزہ لڑکیوں کے لئے موزوں رشتوں کی ضرورت ہے۔ (عمر) قریب ۲۳ و ۲۴ سال (تعلیم) ایم۔ اے۔ بی ایڈ۔

قدامت پسند، پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ خوش خلق۔ (رہائش) گلبرگ، اپنی کوٹھی میں۔

خط و کتابت (بصیغہ راز)

م ۔ش۔ معرفت ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ لاہور

بابُ المراسلات

وفات وحیاتِ مسیحؑ

ایک صاحب لکھتے ہیں:

> قرآن شریف کی رُو سے ایک مسلمان کے لئے تمام سابقہ انبیاءؑ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور ہم ان پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے حضرت عیسےٰؑ کی پیدائش اور وفات کے مسائل نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ یہ گویا ہمارے لئے ایمان کی شرط قرار پاگئے ہیں۔ جو شخص ان مسائل میں مولوی صاحبان کا ہم نوا نہیں ہوتا اس پر کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ حضرت عیسےٰؑ کی نبوت کا قائل ہوتا ہے جو ایمان کیلئے بنیادی تقاضا ہے۔ تمام انبیاء کرامؑ میں سے حضرت عیسےٰؑ کی ان خصوصیات کو اسقدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے اور اسکی وجہ کیا ہے؟ اسے تفصیل سے سمجھائیے گا کہ ان سوالات نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے۔

جواب: ان مسائل نے اسقدر اہمیت کیوں حاصل کر رکھی ہے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکے گی جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے جو دین پیش کیا اسکا مقابلہ نہ یہودیت کر سکتی تھی نہ عیسائیت۔ یہ لوگ قرآن مجید میں تو کوئی ردّ و بدل کر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایسی ایسی روایات وضع کرکے انہیں جزوِ دین بنا دیا جس سے اسلام کی صحیح صورت ہی مسخ ہو گئی۔ اس طرح وہ اگر اپنے مذاہب کو اسلام سے افضل ثابت نہیں کر سکے تو بھی اسلام کو ان کی سطح پر لانے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ہمارے مروّجہ اسلام کا بیشتر حصہ انہی تحریفات پر مشتمل ہے جنہیں "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے۔ اسلام میں اسطرح تبدیلی پیدا کرنے کے بعد سوال انبیاء کرامؑ کا سامنے آیا۔ ان کی محرّف کتابوں میں ان کے انبیاء کی جو زندگی سامنے آتی ہے وہ حضور نبی اکرمؐ کی بلند اور پاکیزہ سیرت کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ ان کی دوسری کوشش یہ تھی کہ وہ حضورؐ کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں جن سے ان کے انبیاء آپؐ سے بلند مقام پر نظر آئیں۔ مثال کے طور پر آپ بخاری شریف میں معراج سے متعلق روایت کو دیکھئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب حضورؐ واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں (آسمان پر) حضرت موسےٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ (اس کے بعد کیا ہوا۔ اسے بخاری شریف کے الفاظ میں سنئیے)

حضرت موسےؑ نے پوچھا کہ آپ کو کیا حکم دیا گیا ہے:

حضرتؐ نے فرمایا مجھے ہر روز پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا آپ کی اُمت ہر روز پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکتی اور میں نے خدا کی قسم آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بہت سخت برتاؤ کیا ہے۔ پس آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی اُمت کے لئے اس سے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ چنانچہ میں لوٹ گیا اور اللہ نے مجھے دس نمازیں معاف کر دیں پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے ویسا ہی کہا پھر میں لوٹ گیا اور اللہ نے مجھ سے دس نمازیں معاف کر دیں پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے ویسا ہی کہا پھر میں خدا کے پاس لوٹ گیا تو مجھے ہر روز پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کس چیز کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا ہر روز پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا آپ کی اُمت ہر روز پانچ نمازیں نہیں پڑھ سکتی اور بے شک میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بہت سخت برتاؤ کیا ہے پس آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی امت کے لیے اس سے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ حضرتؐ نے فرمایا! میں نے اپنے پروردگار سے (کئی مرتبہ) درخواست کی اب مجھے شرم آتی ہے۔ لہٰذا اب میں راضی ہوں اور (اس کے حکم کو) تسلیم کرتا ہوں۔

(صحیح بخاری، جلد دوم۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی صد ۱۷۰-۱۷۱)

آپ غور کیجیے کہ اس روایت کی رو سے (اس خدا کو تو چھوڑیئے جس نے نماز جیسے فریضہ کے متعلق اسطرح حکم دیا) دیکھیئے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں حضور نبی اکرمؐ کی کیا پوزیشن سامنے آتی ہے؟ آپ نے دیکھا کہ یہودی سازش اس ایک روایت کے ذریعے اپنے مقصد میں کسقدر کامیاب ہو گئی؟ اس نے "اپنے نبیؑ" کو کیا مقام عطا کر دیا، اور حضور نبی اکرمؐ کو کس مقام پہ لے آئی! اور پھر سازش کی کامیابی کا یہ عالم کہ مسلمان ان روایات کی حفاظت کے لیے مرنے مارنے تک آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور جو شخص یہ کہہ دے کہ اس سے حضورؐ کی عظمت میں فرق آتا ہے اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی، اسے "منکرِ حدیث" قرار دیکر، دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں کامیاب سازش!!

۲۔ اور آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ نے (از روئے قرآن) حضرت ابراہیمؑ کو اُمتِ مسلمہ کا مورثِ اعلیٰ اور اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کا متبع قرار دیا۔ یہودی حضرت ابراہیمؑ کو بھی نبی تسلیم کرتے تھے لیکن، چونکہ رسول اللہؐ نے اپنے آپ کو ان کی ملت کا پیرو قرار دیا اور انبیاءؑ بنی اسرائیل میں انہیں ایک بلند مقام پر فائز بتایا، انہوں نے (یہودیوں نے) ایک روایت وضع کی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ یہ روایت بھی مجموعہ بخاری میں موجود ہے۔ اس ایک روایت سے انہوں نے "مسلمانوں کے" دو جلیل القدر نبیوں کو جس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا وہ ظاہر ہے۔ یعنی ایک وہ جس نے جھوٹ بولا اور دوسرا وہ جس نے اس کے جھوٹ کی تصدیق کی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اب مسلمان ہیں کہ اس روایت کو اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور یہودی یہ فتنہ چھوڑ کر الگ

بیٹھے ہنس رہے ہیں۔

ہم اس مقام پہ انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ہمارے احادیث کے مجموعوں میں اس اس قسم کی (وضعی) روایات شامل ہیں جن سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ (معاذ اللہ) بیحد داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اسلام کے مخالفین کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ لیکن آج کوئی مسلمان ان کا انکار کرے اور پھر دیکھیے کہ علماء حضرات اس کا کیا حشر کرتے ہیں۔

۳۔ اب آیئے عیسائیوں کی طرف۔ بخاری شریف کے پہلے باب کا عنوان ہے "رسول اللہ کی طرف وحی کی ابتدا کس طرح ہوئی"۔ اس میں کہا گیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپ کا معمول تھا کہ آپ کھانے پینے کا کچھ سامان ساتھ لیکر غار حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں کئی کئی دن لگاتار محو عبادت رہتے۔ واضح رہے کہ اس روایت کا اتنا حصہ بھی اس زمانے کا وضع کردہ نظر آتا ہے۔ جب مسلمانوں میں تصوف آیا اور صوفیائے، پہاڑوں، جنگلوں، غاروں میں ریاضتوں اور مراقبوں کے ذریعے خدا سے "شرف ہم کلامی" حاصل کیا۔ اس "ہم کلامی" کی سند قرآن مجید سے تو مل نہیں سکتی تھی انہوں نے یہ روایت وضع کی کہ خود رسول اللہؐ نے اس طریق سے خدا سے ہم کلامی کا مقام حاصل کیا تھا۔ یہ سارا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ اوّل تو ختم نبوت کے بعد خدا سے ہم کلامی کے امکان کا تصور ہی ختم نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے دوسرے یہ کہ نبوت، خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ مراقبوں اور ریاضتوں سے حاصل نہیں کی جا سکتی تھی اس کے متعلق تو قرآن یہاں تک کہتا ہے کہ ہونے والے نبی کو ایک ثانیہ پہلے بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے اس مرتبۂ بلند کے لئے منتخب کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب اسے وحی سے سرفراز کیا جاتا تھا تو یہ سارا ماجرا واضح طور پر اس کے سامنے آ جاتا تھا۔ پھر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا تھا۔ لہٰذا اس روایت کا شروع کا حصہ بھی اس کے اگلے حصے کیطرح وضعی ہے۔ لیکن ہم نے اسی مقام پہ اسے اس کے اگلے حصے کی نسبت سے درج کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ اس طرح غار حرا میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ:

> فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے (آپ سے) کہا کہ پڑھو! آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں پھر فرشتے نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے (زور سے) دبایا۔ یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھیئے تو میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں پھر فرشتے نے مجھے پکڑ لیا۔ اور (زور سے) دبایا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھیئے۔ تو میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پھر پکڑ لیا اور سہ بارہ مجھے (زور سے) دبایا۔ پھر مجھ سے کہا کہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الخ اپنے پروردگار کے نام (کی برکت) سے پڑھو جس نے (ہر چیز) کو پیدا کیا، انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا اور (یقین کرو کہ) تمہارا پروردگار بڑا بزرگ ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس واقعہ کے سبب سے (مارے خوف کے) ہلنے لگا اور آپ خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور وہاں لوگوں سے کہا کہ مجھے کمبل اڑھا دو مجھے کمبل اڑھا دو۔ ان لوگوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا یہاں تک کہ (جب) آپ کے دل سے خوف جاتا رہا تو آپ نے خدیجہؓ سے سب حال (جو غار میں گزرا تھا)

بیان کر کے کہا کہ بلاشبہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ خدیجہؓ بولیں کہ آپ کو اس قسم کا خیال کرنا ہرگز نہیں (چاہیئے) خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی پریشان نہ کرے گا۔ یقیناً آپ قرابت کی پاسداری کرتے ہیں اور (خدا کی راہ میں) مدد کرتے ہیں۔ پھر خدیجہؓ آپ کو لے کر چلیں اور ورقہ بن نوفل اپنے چچا کے بیٹے کے پاس آپ کو لائیں۔ اور ورقہ ایک شخص تھا جو زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا اور عبرانی کتاب لکھا کرتا تھا یعنی جس قدر اللہ کو منظور ہوتا تھا انجیل کو عبرانی میں لکھا کرتا تھا اور بڑا بوڑھا آدمی تھا کہ بینائی جا چکی تھی تو اس سے خدیجہؓ نے کہا کہ اے میرے بھائی! اپنے بھتیجے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے (ان کا حال) سنو۔ ورقہ بولے اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو؟ رسول خدا صلعم نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کر دیا۔ تو ورقہ نے آپ سے کہا کہ، یہ وہ فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس (زمانہ) میں (جب آپ نبی ہوں گے) جوان ہوتا۔ اے کاش میں (اس وقت تک) زندہ ہی رہتا جب کہ آپ کو آپ کی قوم (مکے سے) نکالے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سنکر بہت تعجب سے) فرمایا کہ کیا یہ لوگ مجھے نکالیں گے؟ ورقہ نے کہا ہاں جس شخص نے آپ کی جیسی بات بیان کی اس سے (ہمیشہ) دشمنی کی گئی اور اگر مجھے آپ (کے نبوت) کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی بہت زوردار مدد کروں گا۔ مگر چند ہی روز میں ورقہ کی وفات ہو گئی اور وحی کی آمد چند روز کے لیئے ملتوی ہو گئی۔

(صحیح بخاری۔ جلد اول۔ حصہ ۱ ترجمہ کا شائع کردہ نور محمد کراچی)

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک وضعی روایت میں عیسائی کیا کچھ کر گئے ہیں؟ وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ رسول اللہ کے سامنے فرشتہ آیا۔ اس نے خدا کی وحی آپ تک پہنچائی۔ خدا نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ لیکن آپ کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کیا ہوا ہے! الٹا آپ پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ بات ایک عیسائی عالم۔۔ ورقہ بن نوفل۔۔ نے بتائی کہ آپ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ آپ کو نبوت سے نوازا گیا ہے! یعنی (۱) ماجرائے نبوت کے متعلق اس عیسائی عالم کو خود صاحب نبوت (نبی اکرمؐ) سے بھی زیادہ علم تھا۔ (۲) اس کے کہنے پر کہ آپ کو نبوت مل رہی ہے آپ اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ گئے۔ (۳) لیکن اس علم وشہادت کے باوجود وہ خود عیسائی کا عیسائی ہی رہا۔ آپ پر ایمان نہ لایا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک روایت سے عیسائیوں نے اپنے ایک عالم کے مقابلہ میں حضورؐ کو کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں انہوں نے (اپنے نبی) حضرت عیسیٰؑ کو ان خصوصیات کا حامل قرار دیا جو (ظاہر ہے کہ) رسول اللہؐ میں نہیں تھیں۔ ان کی (حضرت عیسیٰؑ کی) پیدائش بھی دنیا کے تمام انسانوں، حضرات انبیاء کرامؑ، اور خود حضورؐ نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں منفرد تھی اور ان کی حیاتِ ارضی کی پہلی منزل بھی منفرد۔۔ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے اور زندہ آسمان پر تشریف لے گئے۔ اسطرح انہوں نے، اپنے نبی (حضرت عیسیٰؑ) کی افضلیت حضورؐ نبی اکرمؐ پر ثابت کر دی اور اپنے اس دعوے کی تائید و تصدیق خود مسلمانوں کی روایات سے کر دی۔ اور ان

روایات کی اہمیت اسقدر بڑھا دی کہ یہ مسلمانوں کے ہاں (گویا) جزو ایمان قرار پا گئیں۔

۴۔ اسکے بعد آگے بڑھیئے۔ اس دین کے متعلق جسے حضور نبی اکرمؐ نے پیش کیا تھا، خدا نے کہا ہے کہ لیظہرہ علی الدین کلہ ـــــ وہ تمام ادیان عالم پر غالب آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ غلبہ حضور نبی اکرمؐ کی حیات ارضی میں تکمیل تک نہیں پہنچا تھا۔ اسے آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچنا تھا لیکن نزول حضرت مسیح سے متعلق روایات میں کہا گیا کہ یہ غلبہ حضرت عیسےٰؑ کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچے گا۔ یعنی دین مصطفویؐ کا آخری غلبہ رہین منت ہوگا "عیسائیوں کے نبی" (حضرت عیسےٰؑ) کے ہاتھوں کا ہے جو ان وضعی روایات کی رُو سے (عیسائی) کہہ گئے۔ اور پھر اس کے لئے اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ یہ مسلمانوں کے ایمان کا جزو بن گئیں۔ جب اس قسم کے اعتراضات ابھرے کہ ایک انسان جسد عنصری، آسمان پر زندہ کس طرح رہ سکتا اور واپس آ سکتا ہے تو (اس اعتراض سے بچنے کے لئے) بعض نے کہہ دیا کہ وہ آنے والا مسیح ابن مریم، بہ نفس نفیس نہیں ہوگا۔ ان کا "مثیل" ہوگا۔ سادہ لوح لوگ خوش ہو گئے کہ اس اعتراض کا جواب مل گیا لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے عیسائیوں کے ہاتھ کتنا بڑا حربہ آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سوچو کہ جس نبی کا مثیل، دین محمدیؐ کو غلبہ عطا کرے گا، خود اس نبی کا مقام کسقدر بلند ہوگا۔ یعنی جو بات (معاذ اللہ) نبی اکرمؐ سے نہ ہو سکی، آپ کی امت میں سے کسی سے نہ ہو سکی۔ اسے ہمارے (عیسائیوں) کے نبی کے مثیل نے آ کر پورا کر دیا۔ جب مثیل کی عظمتوں کا یہ عالم ہے تو خود اس نبی کے مقام کی رفعتوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

یہ ہے جو کچھ یہودی اور عیسائی سازشوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے اور ہم ہیں کہ ان روایات کو جزو ایمان بنائے بیٹھے ہیں۔

یاد رکھیئے۔ روایات کے صحیح یا وضعی ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ اور قرآن کریم میں کسی آنے والے کا ذکر نہیں۔ آنے والا، وہ نبی آخر الزمانؐ تھا جو آج سے چودہ سو سال پہلے دین کامل کے ساتھ آ گیا۔ اس کے بعد "آنے والوں" کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

تفہیم القرآن

[مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" پر شاہد عادل کے قلم سے مبسوط تنقید آپ طلوع اسلام کی متعدد اشاعتوں میں مطالعہ فرما چکے ہیں۔ للہ الحمد کہ اس تنقید نے ارباب فکر و نظر کو اس تفسیر پر نگہ باز گشت ڈالنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ذیل کا مراسلہ ملاحظہ فرمائیے۔ طلوع اسلام]

مودودی صاحب کی معرکہ آراء تفسیر "تفہیم القرآن" کی تکمیل پر ایک عظیم جشن منعقد کیا گیا۔ اس جشن میں اس تفسیر پر مودودی صاحب پر گلہائے عقیدت برسائے گئے۔ اس اہتمام کو دیکھ کر تو جو غیر ارادی طور پر اس طرف جاتی ہے کہ اس تفسیر کا وہ کونسا امتیازی نکتہ ہے جس کی وجہ سے اسے لاثانی قرار دیا گیا اور قوم پر ایک عظیم احسان گردانا گیا۔ نکات تو بہت ہیں۔ کہاں تک گنائے جائیں۔ گلہائے رنگا رنگ چاروں اطراف میں

بکھرے پڑے ہیں۔ تاحدِ نظر تحیر انگیز حقائق زیب دہ کتاب ہیں جن کے بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ تاہم تفسیر کی خاصیت یہ ہے کہ مفسر نے بات صاف کرنے کی بجائے داستانوں میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اور اسے اپنے ہی ہاتھوں مجموعہ اضداد بنا دیا ہے۔ انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک چیز کو خود ہی فرض کر لیا گیا ہے اور پھر اس پر حسب منشا حاشیئے چڑھائے گئے ہیں۔ مودودی صاحب کی ذہنی تخلیق کی آمیزش نے قسم آنی حقائق پر چیسے ہوئے پردوں کو اور دبیز کر دیا ہے اس طرح جس چیز کی کسر رہ گئی تھی صاحب موصوف نے اسے پورا کر دیا ہے۔ قرآن اور صاحب قرآن کے خلاف وہ ہرزہ سرائی کی گئی ہے کہ الحذر!! دیگر جلیل القدر انبیاءؑ کو بھی دل کھول کر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔

یہ تو تھا مودودی صاحب کی تفسیر کا انداز۔ لیکن اس وقت مسئلہ زیر بحث وہ رنگ ہے جس میں مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں قرآن اور صاحب قرآنؐ کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس وقت سورۃ" الاعلیٰ" (سورہ نمبر ۸۷) کی صرف دو آیات کی تفسیر قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ترجمہ بھی مودودی صاحب ہی کا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (۶-۷)

ترجمہ: ہم تجھے پڑھوا دیں گے۔ پھر تم نہیں بھولو گے سوائے اس کے جو اللہ چاہے

آیت نمبر (۶) کی تفسیر میں مودودی صاحب وحی کے بارے میں بالصراحت کہتے ہیں کہ

"ہم آپ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کیلئے آپ کو یاد ہو جائیگی اس بات کا کوئی اندیشہ آپ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپ بھول جائیں گے ...... اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا اسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو جائے"

اس سے صاف ظاہر ہے، اور یہ بھی حقیقت، کہ خدا کا منشا یہ تھا کہ قرآن حکیم حضورؐ کے سینہ میں اسطرح جمع اور محفوظ کر دیا جائے کہ اس بات کا کوئی امکان باقی نہ رہے کہ آپ اسمیں سے کچھ بھول جائیں۔ یا کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے نکل جائے کیونکہ خدا ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آیت نمبر (۷) کی تفسیر کرتے ہوئے مودودی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ

اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کا فضل اور اسکی توفیق کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔

دیکھا آپ نے کسقدر تضاد ہے استدلال میں اور الجھاؤ ہے بیان میں۔ آپ ذرا سوچئے کہ جب خدا نے ایسا

چاہا ہی نہیں تھا کہ جو کچھ حضورؐ کے سینہ میں جمع اور محفوظ کرا دیا جائیگا اسمیں سے کچھ بھی حضورؐ بھول سکیں تو دوسرے ہی ٹکڑے کی تفسیر میں خدا کے اس قانون کے پخچے کیوں اُدھیڑ دیئے گئے۔ جب اللہ تعالےٰ نے (CATEGORICALLY) حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۸۷/۶) تو یہ ایسے اعلان کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے خلاف کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا قرآن حکیم کا یہ اعلان مودودی صاحب کے لئے قابل قبول نہیں؟

مگر سب سے زیادہ دل ہلا دینے والا ان آیات کی تفسیر کا وہ حصہ ہے جہاں آپ فرماتے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔

دیکھا آپ نے ایک غلط مفروضہ کی بنا پر مودودی صاحب کس کس قسم کی قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ پہلے ایک بات کو خود ہی وضع کرنا اور پھر اسکی تاویلیں کرنا یہ کہاں کا فہم قرآن ہے۔ اگر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے جناب مودودی قرآن کی بارگاہ سے پوچھتے تو ان آیات کا مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا کیونکہ اسکا دعویٰ ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ اور پھر ایسا کرنے سے ان کا وقت اور توانائی بھی ضائع ہونے سے بچ جاتے جنہیں وہ کسی تعمیری کام میں صرف کر سکتے تھے۔ لیکن جس کے فہم کا انحصار غیر از قرآن پر ہو تو ایسی حالت میں قرآن اُس کی کیا مدد کر سکتا ہے چنانچہ زیر نظر آیات کی تفسیر کی وضاحت میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

اس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبیؓ بن کعب نے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں میں بھول گیا تھا۔

اب صاحب تفسیر نے حضورؐ کو ایسی کشتی پہ سوار کرا دیا ہے کہ وہ "نسیان" کی متلاطم موجوں میں تھپیڑے کھاتی نظر آتی ہے۔ اگر مودودی صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہوتا تو اُن سے ایسی حرکت کبھی سرزد نہ ہوتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مودودی صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس کا جواب تو آپ کو انکی متذکرہ تفسیر کے اگلے ٹکڑے میں مل چکا ہے جہاں (بقول انکے) حضورؐ پہ "نسیان" لاحق ہو جانا صحیح بخاری کی ایک روایت سے ثابت کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں "نسیان" کی مزید تشریح کیلئے مودودی صاحب کے علم و فکر کے سرچشمہ کی چند ایک مثالیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

(۱) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز قائم کی گئی اور صفیں کھڑی کر کے برابر کی گئیں پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے تو جب آپ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ کھڑے ہو گئے اس وقت یاد کیا کہ جنب ہیں۔ پھر ہم سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو اور آپ لوٹے

گئے اور غسل کیا بعد اس کے ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا پھر آپ نے تکبیر تحریمہ کہی اور ہم سب نے آپ کے ہمراہ نماز پڑھی۔

(روایت ۲۶۹ ص ۱۴۰ صحیح بخاری، جلد اول ترجمہ مرزا حیرت دہلوی)

ملاحظہ کی آپ نے "نسیان" کی کیفیت۔ کیا ایسی بھول ایک رسول کے شایانِ شان ہے؟ اور آگے بڑھئے۔

(ب) عبد اللہ بحینہ کہتے ہیں (اور قبیلہ ازد شنوءہ کے ہیں اور بنی عبد مناف کے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے) کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی تو (بھولے سے) پہلی دو رکعتوں (کے ختم) پر کھڑے ہو گئے اور بیٹھے نہیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ جب آپ نماز تمام کر چکے اور لوگ آپ کے سلام پھیرنے کے منتظر ہوئے تو آپ نے بیٹھے ہی بیٹھے تکبیر کہی اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے بعد اس کے سلام پھیرا۔ (روایت نمبر ۷۷۷، ۷۷۸ ایضاً)

(ج) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو (دو رکعتوں کے بعد) آپ نے سلام پھیر دیا۔ ذوالیدینؓ نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا نماز کچھ کم پڑھائی گئی ہے (اس وقت آپ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں) پس آپ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ کیا ذوالیدینؓ صحیح کہتے ہیں؟ ان لوگوں نے عرض کیا جی ہاں تو آپ نے دو رکعتیں اور پڑھیں۔ پھر دو سجدے کئے۔ (روایت نمبر ۱۱۴۳ ایضاً)

اس مضمون کی کئی روایات اور بھی آپ کو ملیں گی لیکن اختصار کے طور پر میں نے چند ایک ہی پر اکتفا کیا ہے۔ مندرجہ بالا روایات ایک تو حضورؐ کا (بقول روایات) نماز میں بھول جانا نظر آئے گا اور دوسرے اس بھول کے کفارہ میں دو سجدے (سہو کے) ادا کرنا نظر آئیں گے۔ ان دو سجدوں کی اساس بھی ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص تم میں سے نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان آتا ہے اور اس کے دل میں شبہ ڈال دیتا ہے یہاں تک کہ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے نماز کس قدر پڑھی۔ لہٰذا جب یہ بات کسی کو پیش آوے تو اُسے چاہئے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے کر لے۔ (روایت نمبر ۱۱۴۱ ایضاً)

اس روایت کی رو سے جو کوئی نماز میں بھول جاتا ہے وہ شیطان کے غلبہ کی وجہ سے بھول جاتا ہے لہٰذا (معاذ اللہ بقول ان کے) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شیطان کے غلبہ کی وجہ سے نماز میں بھول جاتے تھے جس کی وجہ سے دو سجدے (سہو کے) ادا کرتے تھے۔ دیکھا آپ نے کہ متذکرہ تفسیر میں مودودی صاحب کے بیان کردہ "نسیان" کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے یا (معاذ اللہ) تضحیک؟

لیکن ہمارا ہادی قرآن عزیز (قرآن حکیم) کا فتویٰ اس بات میں کچھ اور ہے۔ قصہ آدم کی تمثیل میں ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کیلئے مہلت مانگی تاکہ وہ لوگوں کو بہکا سکے اور ان کے دل میں وسوسہ ڈال سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اسکو مہلت دیدی اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ (۱۵/۴۲)

تیرا غلبہ میرے مخلص بندوں پر نہیں ہو سکے گا۔ تیرا بس انہیں پر چلیگا جو متوازن راہ چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔

اور پھر اس کا اعتراف خود ابلیس نے بھی کیا تھا کہ

(بقیہ صفحہ ۵۶ پر)